اخبار آحاد
اور ان کی استدلالی حیثیت

❁ ❁ ❁

مؤلف

محمد عبداللہ لاجپوری

خادم : دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا بھروچ، گجرات

❁ ❁ ❁

تحت الإشراف والتقدیم

(حضرت مولانا مفتی) اقبال بن محمد ٹنکاروی (صاحب)

مہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ

(تفصیلات)

نام کتاب : اخبارآحاداوران کی استدلالی حیثیت

مؤلف : محمدعبداللہ لاجپوری (استاذ دارالعلوم ہذا)

تعداد صفحات : ۱۶۴

سن طباعت : ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰۱۵ء

ایڈیشن : پہلا

تعداد : ۱۰۰۰

❖❖❖❖

مکتبہ ابوبکر ربیع بن الصبیح البصری (البروصی)

دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، عیدگاہ روڈ

بھروچ، گجرات، الہند۔۳۹۲۰۰۱

فہرست مضامین

بسم الله الرحمن الرحیم

مقدمہ

حضرت مولانا، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی دامت برکاتہم
استاذ حدیث وفقہ ومہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاة والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین ،

وعلی آلہ وصحبہ اجمعین . اما بعد!

خبر واحد کے افادۂ علم میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) بعض کے نزدیک یہ مفید ظن ہوتی ہے۔(۲) بعض کے نزدیک یہ اپنی تمام صورتوں میں مفید علم (یقینی) ہوتی ہے، خواہ اس کے ساتھ کوئی قرینہ شامل ہو یا نہ ہو۔ اہل ظاہر یہی کہتے ہیں اور امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔(۳) بعض کے نزدیک اگراس کے ساتھ قرینہ شامل ہوتو مفید علم ہوتی ہے ورنہ نہیں، نظام اوران کے متبعین کا یہی مسلک ہے اورآمدی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ (۴) بعض اصحاب حدیث کے نزدیک بلاقرینہ صرف بعض صورتوں میں مفید علم ہوتی ہے ،تمام صورتوں میں نہیں، مثلاً حدیث مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور اس جیسی سند کی حدیث مفید علم ہوگی۔(۵) باقی تمام لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ مفید علم نہیں ہوتی، نہ قرینہ کے ساتھ اور نہ بلاقرینہ۔

امام بزدوی لکھتے ہیں کہ یہ علم یقینی کا افادہ نہیں کرتی؛ بلکہ اس سے علم غالب رائے پیدا ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خبر واحد کی قبولیت کے لئے مندرجۂ ذیل شرائط عائد کرتے ہیں:

(۱) خبر واحد اس صورت میں مقبول ہے جب کہ وہ سنت مشہورہ (خواہ قولی ہو یا فعلی) کے خلاف نہ ہو، اس لئے کہ دو دلیلوں میں سے اس دلیل پر عمل کیا جاتا ہے جو قوی تر ہو۔

(۲) خبر واحد اس عمل متوارث کے خلاف نہ ہو، جو صحابہ وتابعین میں مشترکہ طور سے پایا جاتا ہے، خواہ وہ کسی شہر میں بھی سکونت پذیر ہوں، اس میں کسی شہر کی کوئی تخصیص نہیں۔

(۳) خبر واحد اس صورت میں مقبول ہے جب کہ کتاب اللہ کے عمومات وظواہر کے خلاف نہ ہو، اس لئے کہ کتاب اللہ کے ظواہر وعمومات قطعی الدلالت ہیں اور قطعی ظنی کے مقابلہ میں مقدم ہوتا ہے، جس صورت میں خبر واحد کتاب اللہ کے عموم یا ظاہر کے خلاف نہ ہو، بلکہ قرآن کی شرح وتفسیر پر مشتمل ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس پر عمل کرتے ہیں، اس لئے کہ شرح وتفسیر کے بغیر آیت قرآنی کسی بات پر دلالت ہی نہیں کرسکتی۔

(۴) جب خبر واحد قیاس جلی کے خلاف ہو تو اس صورت میں مقبول ہوگی؛ جب کہ اس کا راوی فقیہ ہو، راوی کے غیر فقیہ ہونے کی صورت میں اس امر کا احتمال ہے کہ راوی نے روایت بالمعنی کی ہو اور اس میں اس سے غلطی سرزد ہوگئی ہو۔

(۵) یہ خبر واحد کا تعلق ایسے امور کے ساتھ نہ ہو جو عام لوگوں کو پیش آتے ہیں،

مثلاً حدود و کفارات جو ادنی شبہ پیدا ہو جانے کی صورت میں باقی نہیں رہتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عادۃً ایسے امور سے اکثر لوگ باخبر ہوتے ہیں، نہ کہ صرف ایک دو شخص، اس لئے ایسے واقعات میں شہرت اور تلقی بالقبول ضروری ہے۔

(٦) عہد سلف میں کسی عالم نے اس حدیث پر جرح وقدح نہ کی ہو، نیز یہ کہ حدیث کے راوی نے کسی دوسرے صحابی کے اختلاف کی وجہ سے اس پر عمل کو ترک نہ کیا ہو۔

(٧) قبولیت خبر واحد کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ راوی کا عمل اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف نہ ہو، مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث روایت کی کہ جب کتا کسی برتن میں منہ ڈالے تو اسے سات مرتبہ دھویا جائے؛ مگر وہ اس کے خلاف فتوی دیتے تھے، اس لئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی روایت کردہ حدیث پر عمل کرنا ترک کر دیا۔

(٨) خبر واحد اس صورت میں مقبول ہے، جب اس کا راوی دیگر ثقہ راویوں کے خلاف اس حدیث کی سند یا متن میں کوئی اضافہ نہ کر رہا ہو، اگر وہ اضافہ کرے گا تو بنابر احتیاط ثقات کی روایت پر عمل کیا جائے گا اور اس کے اضافہ کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

(تانیب الخطیب محمد زاہد الکوثری:١٥٣، شرح التوضیح:٢/٢٥٠)

شیخ وہبہ زحیلی خبر واحد کی حجیت اور خبر واحد پر عمل کرنے کے سلسلہ میں علماء کرام کے مذاہب ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

للائمة الاربعة مسالك فی العمل بخبر الواحد.اما الحنفية : فانهم يشترطون للعمل بخبر الواحد شروطا ثلاثة:

(١)الا يعمل الراوي بخلاف ما يرويه فان خالف فالعمل برأيه لا بروايته، اذ ان مخالفته لم تكن الا بسبب ناسخ عَلِمَه، لهذا لم يعملوا بخبر ابي هريرة في

الـكلب، "اذا ولغ الكلب في اناء احدكم فليغسله سبعا احداهن بالتراب"، قالوا: فان ابا هريرة اكتفى بالغسل ثلاثا كما روي الدارقطني.

(٢)الا يـكـون مـوضـوع الـحـديـث فيـمـا يـكثر وقوعه وتعم البلوى به ويحتاج الناس الى بيانه؛ اذ ان ما شأنه كذلك ان تتوافر الدواعي على نقله بطريق التـواتـر اوالشهـرـة، فـروايتـه بـطريق الآحاد تورث الشك في صحة صدوره عن الـرسـول صـلى الله عليه وسلم، لهذا لم يعملوا بحديث رفع اليدين عند الركوع فـي الـصـلاـة، ويـلاحظ ان الشافعية اثبتوا نقل هذا الحديث عن اكثر من سبعين صحابيا.

(٣) الايكون الحديث مخالفا للقياس والاصول الشرعية اذا كان الراوي غيـر فـقيه، اذ ان الرواية بالمعنى كانت مستفيضة بين الرواة، فاذا لم يكن الراوي فـقيهـا، كـان مـن الـمحتمل ان يذهب شيء من المعنى الذي يبني عليه الحكم، ومـن الـرواـة غيـر الـفقهاء عندهم: ابو هريرة وسلمان الفارسي وانس بن مالك، لهـذا لـم يـعملوا بحديث ابي هريرة في الشاة او الناقة المصراة (التي يجمع اللبن فـي ضـرعهـا) وهـو قـولـه صـلـى الله عليه وسلم : لا تُصروا الابل والغنم، فمن ابتـاعهـا بـعـد فهـو بخير النظرين، بعد ان يحتلبها، ان شاء امسك وان شاء ردها وصاعا من تمر.

قـالـوا: ان رد صـا ع من تمر بدل اللبن مخالف للقياس ولقواعد الشرعية، فهـو مـخالف للمقرر في الضمان وهو المثل في المثليات والقيمة في القيميات، ومـخـالف ايـضـا لـقاعدة "الخراج بالضمان" التي تجعل الغلة الناتجة من العين

ملكا لمن هي في ضمانه؛ ومقتضى ذلك ان اللبن للمشتري، فالامر برد صاع من تمر مخالف لهذه القاعدة.

والحقيقة ان هذا الشرط هو رأي عيسى بن ابان وتابعه عليه متأخرو الحنفية، والمعتمد عندهم تقديم الخبر مطلقا، وان ابا هريرة كان فقيها، وابو حنيفة نفسه يعترف بفقهه، فقد اخذ بحديثه في افساد الصيام وهو قوله عليه السلام: "من اكل او شرب ناسيا فليتم صومه فانما اطعمه الله وسقاه"، وقال ابو حنيفة: لولا الرواية لقلت بالقياس، اى بفساد الصوم، فيكون ترك الحنفية للعمل بحديث المصراة باسباب اخرى غير القدح في الصحابي كالقول بان الحديث مضطرب او منسوخ او لم تثبت صحته لديهم، وفي الجملة: لقد ناقشهم العلماء في اعذارهم وردوها كلها، قال الصنعاني في سبل السلام: الحديث اصل في النهي عن الغش، وهو تحريم التصرية للمبيع وثبوت الخيار بها.

(اصول الفقه الاسلامی: ۱/۴۷۰،۴۷۱)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے خبر واحد کے اہتمام شان کے پیش نظر بخاری شریف میں مستقل ایک عنوان قائم کیا، "کتاب اخبار الآحاد" اس میں چھ(٦) ابواب قائم کئے ہیں، اور خبر واحد کے قبول کرنے پر۲۵/دلائل ذکر کئے، بعض دلائل کتاب وسنت کے حوالہ سے ذکر کئے، مثلاً باب ماجاء فی اجازۃ خبر الواحد الصدوق فی الاذان والصلاۃ والصوم والفرائض والاحکام، وقول اللہ تعالیٰ: وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ، فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون. (التوبۃ:۱۲۲) دوسری آیت: وقولہ تعالیٰ ان جاء کم فاسق بنبأ

فتبينوا (الحجرات:٦) وكيف بعث النبى صلى الله عليه وسلم امراء ه واحدا بعد واحد، فان سها احد منهم رُد الى السنة . (قبل حدیث۷۲۴۶) " فان سها" والی عبارت تعارض یا خطا کی طرف اشارہ کرتی ہے،اوراس عبارت میں اہل سنت والجماعت کی تائید ہوتی ہے کہ خبرواحدظن کا فائدہ دیتی ہے، یقین کانہیں،لیکن محض ظن کی وجہ سے ردنہیں کی جائے گی؛ کیوں کہ عمومی احکام غلبۂ ظن سے ہی مستفاد ہوتے ہیں،لہذا جب تک اس کے معارض اس سے کوئی قوی دلیل نہ ہوخبرواحد پرعمل کرنا واجب ہوگا،امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پندرہ دلائل سنت سے ذکر کررہے ہیں،جوخبر واحد کی حجیت پردلالت کرتی ہیں۔(حدیث ۷۲٤۷،۷۲٤۸، ۷۲٥۰،۷۲٥۱،۷۲٥٤،۷۲٥٦،۷۲٦۰،۷۲٦۱،۷۲٦۲،۷۲٦۳)

پھراخیر میں ایک باب"باب خبر المرأة الواحدة" سےثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایک مرد کی طرح ایک سچی عورت کی خبربھی قبول کی جائے گی اوراس پربھی احکام کی بناہوگی۔ (حدیث ۷۲٦۷) کتاب اخبارالآحاد کےعلاوہ بھی دومقامات پرامام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نےخبر واحد کی حجیت کوذکر کیا ہے:(۱)باب هل يجوز للحاكم ان يبعث رجلا واحدا وحده للنظر فى الامور. (حدیث۷۱۹۳)(۲)باب ترجمة الحكام وهل يجوز ترجمان واحد.

(قبل حدیث۷۱۹۵)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر احکام کے دلائل تفصیلیہ کے لئےخبر واحدکوحجت بنایاہے،البتہ عقائد کےثبوت کے لئےخبر واحد کے حجت ہونےکوصراحۃً ذکرنہیں کیا ہے،اس وجہ سےبعض شراح نے یہ لکھا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ خبر واحد کی عقائد کے سلسلہ میں حجیت کے قائل نہیں ہے، چنانچہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ کرمانی کے حوالہ سے لکھا ہے:

ليعلم انما هو في العمليات ، لا فى الاعتقاديات.(فتح الباری:۱۳/۲۳٤،عمدۃ القاری:۲۰/۱۸۸)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں اس کی صراحت نہیں ہے؛ البتہ ان کے کلام کے مفہوم مخالف سے یہ محسوس ہورہا ہے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب حدیث کے قبول ورد کے سلسلے میں حنفیہ کا مذاق خاص ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حنفیہ کے طریقۂ استدلال کے سلسلہ میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں روایات کے مقبول اور نامقبول ہونے میں اس بات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ جو روایت شریعت کے عمومی مزاج و مذاق اور اصول وقواعد سے مطابقت رکھتی ہے، بعض اوقات سند میں ضعف کے باوجود مقبول ہوتی ہے اور بعض روایتیں گوسند کے اعتبار سے قوی ہوتی ہیں؛ لیکن چوں کہ اپنے مضمون اور متن کے اعتبار سے شریعت کے عام اور مسلمہ اصول ومبادی کے خلاف ہیں؛ اس لئے ایسی حدیثیں رد کردی جاتی ہیں، چنانچہ قاضی ابوزید دبوسی فرماتے ہیں: الاصل عند اصحابنا ان خبر الآحاد متی ورد مخالفا لنفس الاصول لم یقبل اصحابنا.

ہمارے اصحاب کے نزدیک اصول یہ ہے کہ خبر واحد نفس اصول کے خلاف ہو تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

حنفیہ کے یہاں بہت سے مسائل ہیں جو بظاہر اسی اصول پر منطبق ہیں، جیسے حیوانات کے فضلہ کا ناپاک ہونا، عورت کے یا شرم گاہ کے چھونے کا ناقض وضو نہ ہونا، پتھر سے استنجاء میں تین پتھروں کا واجب نہ ہونا اور جس جانور کا دودھ تھن میں روک رکھا گیا ہو، (مصراۃ) اس کو فروخت کرنے کے مسئلہ میں حدیث کی ظاہری مراد پر عمل کرنے کے بجائے تاویل وتوجیہ کی راہ اختیار کرنا اور اس طرح کے کتنے ہی مسائل ہیں؛ جن میں نمایاں طور پر اس قاعدہ

کا اثر محسوس ہوتا ہے۔

متعارض احادیث کی ترجیح میں بھی حنفیہ نے اس اصول سے فائدہ اٹھایا ہے، جیسے صلوۃ کسوف (سورج گہن کی نماز) ہی سے متعلق روایتوں کو دیکھئے ؛ جن میں ایک رکعت میں ایک رکوع سے پانچ رکوع کی تعداد مروی ہے، جمہور نے سند کے قوی ہونے پر نگاہ رکھتے ہوئے اس روایت کو ترجیح دیا، جس میں ایک رکعت میں دو رکوع کا تذکرہ ہے، حنفیہ نے ان روایتوں کو ترجیح دیا، جس میں ایک رکوع کا اشارہ ملتا ہے؛ کیوں کہ یہ نماز کی عمومی کیفیت سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

حنفیہ کے بعد غالبًا مالکیہ کے یہاں اس اصول کو زیادہ برتا گیا ہے، علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اس طرح روشنی ڈالی ہے: خبر واحد جب شریعت کے قواعد میں سے کسی قاعدہ کے معارض ہو تو کیا اس پر عمل کرنا جائز ہوگا؟ امام ابوحنیفہ نے کہا کہ اس پر عمل کرنا جائز نہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جائز ہے، اور امام مالک کو اس میں تردد ہے، اور مشہور قول جس کو قبول کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اگر دوسرا قاعدہ اس کی تائید میں ہو تو اسے قبول کیا جائے گا اور اگر خبر واحد تنہا ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

حدیث کے مقبول ہونے کے سلسلہ میں حنفیہ کے یہاں ایک اہم اصول یہ ہے کہ حدیث کا صحابہ وتابعین اور ائمۂ مجتہدین کے درمیان درجۂ قبول حاصل کر لینا، بجائے خود اس کے معتبر ومقبول ہونے کی دلیل ہے، اسی کو اہل علم نے تلقی بالقبول سے تعبیر کیا ہے، ''تلقی بالقبول'' کی وجہ سے بعض روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے باوجود اہل علم کے یہاں پایۂ قبول حاصل کر لیتی ہیں اور اگر صحیح یا حسن ہیں تو ان کے استناد واعتبار میں اضافہ ہو جاتا ہے؛ بلکہ بعض محققین کے نزدیک تو وہ تواتر کے درجہ میں آجاتی ہے، چنانچہ حضرت

عائشہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے ''طلاق الامة ثنتان وعدتها حيضتان '' والی روایت منقول ہے؛ ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے لکھا:

و ان كان واردة من طريق الآحاد ، فصار حيز التواتر لأن ما تلقاه الناس من اخبار الآحاد بالقبول فهوعندنا فی معنی المتواتر لما بیناه.

(احکام القرآن الکریم للجصاص:۲،۱۳۰)

اگر چہ یہ خبر واحد کے طریقہ پر وارد ہوئی ہے؛ لیکن یہ تواتر کے درجہ میں ہے، اس لئے کہ جس خبر واحد کو لوگ قبول کرلیں، وہ ہمارے نزدیک تواتر کے حکم میں ہے، اسی بناء پر جو ہم بیان کرچکے ہیں۔

مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس موضوع پر بحث کے بعد رقم طراز ہیں:

بل الحديث اذا تلقته الامة بالقبول فهو عندنا فی معنی التواتر.

(قواعد فی علوم الحديث:٦٢)

بلکہ حدیث کو جب امت میں قبول عام حاصل ہوجائے تو ہمارے نزدیک وہ تواتر کے معنی میں ہے۔ (فقہ حنفی اور حدیث:ص:۱۲-۱۷،ط:ایفا پبلیکیشنز)

اصول فقہ میں احناف کی دوسری خصوصیت نصوص شرعیہ سے غایت درجہ اعتناء ہے، اصحاب رائے خبر واحد کے مقابلہ میں قیاس کو قابل ترجیح تصور کرتے تھے، خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا رجحان بھی شاید اسی طرف تھا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ روایت نقل کی کہ آگ میں پکی ہوئی چیزوں کے استعمال سے وضوء ٹوٹ جائے گا تو ابن عباس نے قیاس ہی سے اس کا رد فرمایا کہ اگر ایسا ہو تو گرم پانی سے وضو کرنے کا حکم کیا ہوگا؟ لو توضأت بماء سخن ؟ اسی طرح جب یہ روایت آپ رضی اللہ عنہ تک پہنچی کہ جنازہ

اٹھانے والے پر وضوء واجب ہے **من حمل فلیتوضأ** تو فرمایا کہ کیا خشک لکڑیوں کے اٹھانے سے ہم پر وضوء واجب ہوجائے گا **اتلزمنا الوضوء عیدان یابسة ؟** امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اصحاب رائے میں شمار کئے جاتے ہیں، مگر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے خبر واحد کو قیاس پر مقدم رکھا:

اذا تعارض خبر الواحد والقیاس بحیث لاجمع بینھما ممکن قدم الخبر الواحد مطلقا عند الاکثرین، منھم ابو حنیفة والشافعی واحمد.

خبر واحد اور قیاس میں ایسا تعارض واقع ہوجائے کہ دونوں کے درمیان تطبیق ممکن نہ رہے تو اکثر علماء کے نزدیک خبر واحد مقدم ہوگی، یہی رائے امام ابوحنیفہ، شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کی ہے۔

پھر چوں کہ قرآن مجید کی اولیت اور استناد واعتبار کے لحاظ سے اس کے تفوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے احناف نے خبر واحد کے ذریعہ کتاب اللہ کے عموم کی تخصیص اور اطلاق کی تقیید کی اجازت نہیں دی ہے، لہذا ان فقہاء نے خبر متواترہ اور خبر واحد کے درمیان حدیث کی ایک قسم مقرر فرمائی اور اس کو ''خبر مشہور'' سے تعبیر کیا، ایسی روایت جو قرن اول میں تو خبر واحد ہی رہی ہو، لیکن اس کے بعد اس کو قبول عام حاصل ہوگیا ہو اور اس کے ذریعہ کتاب اللہ میں تخصیص اور تقیید وغیرہ کی اجازت دی، اس طرح خبر واحد کا ایک قابل لحاظ حصہ اپنے ظاہری مفہوم کے ساتھ مقبول اور معمول ہوگیا۔

گویا خبر مشہور وہ ہے جو گو عہد صحابہ میں اخبار آحاد کے قبیل سے ہو، لیکن تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں اسے قبول عام حاصل ہوگیا ہو، علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے؛ چنانچہ خبر مشہور کے ذریعہ کتاب اللہ پر زیادتی کے درست ہونے کی وجوہ پر گفتگو

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لان الامة تلقته بالقبول واتفاقهم على القبول لايكون الا بجامع جمعهم على ذلك. (المنار مع کشف الاسرار:۱۳/۲)

اس لئے کہ علماء کے درمیان قبول عام اور قبولیت پر اتفاق کسی ایسے سبب سے ہی ہوسکتا ہے، جس نے ان سب کو اس پر متفق کیا ہو۔

حالاں کہ حنفیہ کے یہاں خبر واحد سے کتاب اللہ کے عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید نہیں کی جاسکتی، لیکن متعدد روایتیں ہیں کہ احناف نے ان کے ذریعہ تخصیص وتقیید کی ہے، جیسے: "القاتل لايرث" قاتل (مقتول سے) وارث نہیں ہوسکتا۔

يقيد الاب من ابنه ولا يقيد الابن من ابيه. (باپ بیٹے سے قصاص لے گا، بیٹا باپ سے قصاص نہیں لے سکتا)

لا زكوة فى مال حتى يحول عليه الحول. (مال میں زکوۃ نہیں، جب تک اس پر سال نہ گذر جائے)

اسی لئے کہ یہ اور اس طرح کی اخبار آحاد نے قبول عام کی وجہ سے ایک خصوصی درجہ استناد واعتبار حاصل کرلیا ہے۔ (فقہ حنفی اور حدیث، ص:۲۰)

حنفیہ کے یہاں حدیث پر عمل کا اس درجہ کا اہتمام ہے کہ ان کے یہاں یہ بات اصول کے درجہ میں ہے کہ جن مسائل میں کوئی صحیح حدیث موجود نہ ہو؛ لیکن ایسی ضعیف روایات موجود ہوں جن کے راوی پر کذب کی تہمت نہ ہو، تو بمقابلہ قیاس کے ایسی ضعیف احادیث پر عمل کیا جائے گا، مشہور محدث اور فقیہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے حنفیہ کا مذہب اس طرح

بیان کیا ہے:

ان مذهبهم تقديم الحديث الضعيف على القياس المجرد الذى يحتمل التزييف. (مرقاة المفاتيح: ۱/۳)

حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ حدیث ضعیف کو مجرد قیاس پر، جو کھوٹ کا احتمال رکھتا ہے، مقدم رکھا جائے۔

علامہ ابن حزم کو بھی اعتراف ہے کہ **جميع الحنفية مجمعون على ان مذهب ابى حنيفة هى ان ضعيف الحديث عنده اولى من الرأى.**

(مقدمة فى علوم الحديث للتهانوى: ٦٩)

تمام احناف اس بات پر متفق ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث بھی قیاس سے بڑھ کر ہے۔

اور علامہ ابن القیم رقمطراز ہیں: **واصحاب ابى حنيفة مجمعون على ان مذهب ابى حنيفة ان ضعيف الحديث عنده اولى من القياس والرأى، وعلى ذلك مبنى مذهبه كما قدم حديث القهقهة مع ضعفه على القياس والرأى.**

(اعلام الموقعين: ۱/۷۷)

حنفیہ اس بات پر متفق ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک قیاس اور رائے پر مقدم ہے، اور اسی پر ان کے مذہب کی بنیاد ہے، جیسا کہ انہوں نے قہقہہ کی حدیث کو اس کے ضعیف ہونے کے باوجود قیاس و رائے پر ترجیح دی ہے۔

الحمد للہ دار العلوم ماٹلی والا کے شعبۂ تخصص فی الحدیث میں تخریج وتحقیق کا کام کرنے والے باذوق وہمت والے صالح نوجوان فاضل مولانا عبداللہ لاجپوری صاحب نے زجاجۃ المصابیح کی تخریج کے کام کے ساتھ ساتھ ''اخبار آحاد کی استدلالی حیثیت'' نامی کتاب بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی ہے، جس میں ابتدائی تمہیدی کلام کے بعد خبر واحد کی قبولیت کی شرائط پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اس کا دیگر ادلۂ شرعیہ سے موازنہ اور حنفیہ کا موقف بہت اچھے انداز میں واضح کیا ہے۔ جس سے اس موضوع پر اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا ہے جو اس موضوع کے متلاشی حضرات کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوگا - ان شاء اللہ العزیز - حق سبحانہ وتعالی کی بارگاہ عالی میں دعاء ہے کہ وہ فاضل مؤلف کی حدیثی خدمات کو قبول فرما کر مزید توفیق عنایت فرمائے آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

(حضرت مولانا مفتی) **اقبال محمد ٹنکاروی** (دامت برکاتہم)

استاذ حدیث وتفسیر ومہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا،

بھروچ گجرات، الہند۔

۳۰/ذوالقعدہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۵/ستمبر ۲۰۱۵ء۔

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

الحمد لله أسبغ علينا النعمة، ورضي لنا الاسلا م دينا ومنهجا، وجعلنا خير أمة، وأنزل الكتا ب هدىً للناس ورحمة، والصلاة والسلام علٰى نبيه وصفيه محمّد، الذي منّ اللّٰه به علينا منة، أي منة، وعلىٰ اٰله وأصحابه البررة، الحفظة للقرآن والسنة، وبعد!

اس میں شک نہیں کہ حضورﷺ کی سنت مبارکہ نہ صرف قرآن کریم کی بہترین شرح اور عمدہ تفسیر ہے، بلکہ قرآن کریم کے بعد شریعت کا ایسا بنیادی مصدر ہے، جس کے مصدر ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مطلق حدیث کے حجت شرعیہ ہونے کا منکر ہرطبقۂ امت میں کافر قرار پایا، حدیث کے تعلق سے جو کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کا تعلق محض طریقۂ ثبوت سے ہے، بعض حضرات متواتر کی قید لگاتے ہیں، بعض مشہور ہونے کی اور بعض عزیز ہونے کی، جب کہ بعض صرف خاندانِ اھلِ بیت کی روایات سے استدلال کرنے کے قائل ہیں، مگر جمہورِ امت کے نزدیک جب خبرِ واحد ثقہ رواۃ کے ذریعہ منقول ہوکر آئے تو وہ بھی حجت تسلیم کی جاتی ہے، مطلق حدیث کے انکار کا نظریہ امت میں کبھی نہیں رہا، یہ نظریہ اور اس کے حاملین تیرھویں صدی ہجری کی پیداوار ہیں، جو شریعت اسلامی کے بنیادی مصدر کے متعلق امت میں شکوک وشبہات پھیلانے کی کوشش کررہے ہیں۔

اس نظریہ کی تردید کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں رجال کو پیدا کیا، جمہورِ امت

نے اخبارِ آحاد کو حجت قرار دیا جمہور اہل اسلام، صحابہ تابعین، محدثین، فقہاء اور اصحاب اصول کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ ثقہ راوی سے منقول خبر واحد دیگر شرعی دلائل کی طرح ایک لازم العمل حجت ہے، خبر واحد سے ظنی علم حاصل ہوتا ہے، قطعی و یقینی نہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ تفصیل ہے: (۱) روافض، قدریہ اور بعض اہل ظاہر کے نزدیک خبر واحد پر عمل کرنا واجب نہیں۔ (۲) معتزلہ میں سے جبائی کا قول ہے کہ اس روایت پر عمل واجب ہے، جس کو کم از کم دو راوی دوسرے دو راویوں سے نقل کریں۔ (۳) بعض علماء کے نزدیک واجب العمل وہ روایت ہے، جس کو کم از کم چار راوی دوسرے چار راویوں سے روایت کریں۔ مذکورہ تینوں اقوال جمہور علماء اسلام کے خلاف اور باطل ہیں۔

اس لئے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے مختلف سلاطین کے نام جو خطوط صرف ایک ایک قاصد کے ذریعہ ارسال فرمائے تھے ان کو واجب التعمیل قرار دیا تھا اور ان پر عمل بھی کیا گیا تھا، بعد ازاں خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ و سلف و خلف ہمیشہ ایک شخص کی روایت کو تسلیم کرتے رہے، وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اپنے قضایا و فتاوی میں اس کی طرف رجوع کرتے، اس حدیث کی روشنی میں وہ اس کے خلاف فیصلہ کو رد کر دیتے خبر واحد کی بناء پر وہ مخالفین پر حجت قائم کرتے اور مخالف اس کو تسلیم کر لیتا، یہ ایسی طے شدہ بات ہے جس میں شک و شبہ کوئی گنجائش نہیں، عقل انسانی بھی خبر واحد پر عمل کرنے کو محال نہیں سمجھتی اور شریعت بھی اسی کی مؤید ہے، لہذا اس کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

بعض علماء نے خبر واحد کے مقبول ہونے پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ جب کسی صحابی یا تابعی سے کوئی دینی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو سائل کو اس سے آگاہ کرتے وقت یہ شرط عائد نہیں کیا کرتا تھا کہ جب تک کسی اور شخص سے اس کی تصدیق نہ کر لے اس پر عمل نہ کرے، برخلاف اس کے کہ سائل کو مسئولہ بات بتا دی جاتی اور وہ اس کی تعمیل کرنے لگتا اور کوئی شخص بھی اس کے طرز عمل پر معترض نہ ہوتا، اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سب صحابہ خبر واحد کو واجب العمل قرار دیتے تھیں، اور اگر بعض اوقات کسی صحابی یا تابعی نے اس ضمن میں شک وشبہ کا اظہار کیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ خبر واحد کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے تھے، بلکہ اس کے وجوہ واسباب کچھ اور تھے، مثلاً یہ کہ وہ حدیث صحیح نہیں، اس کا راوی متہم بالکذب ہے یا اس حدیث کے مخالف کوئی اور حدیث ہے جو اس سے راجح ہے وغیرہ۔ (تاریخ حدیث ومحدثین: ۳۹)

امام ابن قیمؒ (م: ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں: کہ صحابہ اور ائمہ ثقات کی حدیث کو صرف اس وجہ سے رد نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا راوی منفرد ہے، اس لئے کہ بہت سی احادیث ایسی ہیں جن کو ایک ہی صحابی نے روایت کیا ہے، اس کے باوجود محدثین نے ان کی روایات کو قبول کر لیا ہے اور کسی نے بھی رد نہیں کیا، اسی طرح بہت ساری احادیث کی نقل وروایت میں ایک ہی تابعی منفرد ہے، مگر کوئی محدث ان کی روایت قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا، ہمارے علم کی حد تک سلف وخلف علماء میں سے ایک بھی ایسا نہیں، جس نے یہ بات کہی ہو کہ جب کسی حدیث کو ایک ہی راوی روایت کرے، تو اس کی روایت کردہ حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔ البتہ اہل بدعت اور غیر معروف لوگوں

سے اس قسم کے اقوال مروی ہیں کہ خبر واحد حجت نہیں۔امام زہری (م:۱۲۴) تقریباً ساٹھ احادیث روایت کرنے میں منفرد ہیں، مگر وہ تمام ائمہ کی معمول بہا ہیں اور منفرد ہونے کی بناء پر ان کو مردود قرار نہیں دیا گیا۔

خلاصہ یہ کہ ائمہ حدیث اور ان کے متبعین میں سے کسی نے بھی خبر واحد کو رد کرنے کا قول ظاہر نہیں کیا، ورنہ ان کے اکثر اقوال وفتاویٰ باطل ٹھہرتے، اگر سوال کیا جائے کہ حدیث شاذ کو قبول نہیں کیا جاتا؛ بلکہ اس کے قبول وعدم قبول میں توقف سے کام لیا جاتا ہے اور حدیث شاذ بھی خبر واحد ہی کی طرح ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خبر واحد اور حدیث شاذ میں فرق ہے، حدیث شاذ وہ ہوتی ہے، جس میں ایک راوی ثقہ راویوں کی مخالفت کرتا ہے اور ان کی روایت سے اختلاف کرکے ایک الگ روایت ذکر کرتا ہے ۔جبکہ خبر واحد اس سے مختلف ہے، جب ثقہ راوی ایک روایت بیان کرنے میں منفرد ہو اور ثقہ راویوں نے اس کے خلاف حدیث روایت نہ کی تو اس کو شاذ نہیں کہتے ہیں۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث شاذ کے یہ معنیٰ نہیں کہ ایک ثقہ راوی کسی حدیث کی روایت کرنے میں منفرد ہو، برخلاف اس کے شاذ اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا راوی ثقہ راویوں کی مخالفت کرے۔(اغاثۃ اللہفان لابن قیم:۲۳۲)

بعض احادیث پر عمل نہ کرنے کی وجہ:

اگر معترض اعتراض کرے کہ آپ کے نزدیک حدیث بہر دو صنف: متواتر وآحاد واجب العمل ہے اور اس کی خلاف ورزی کسی صورت میں بھی جائز نہیں، پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ائمۂ مجتہدین بعض مسائل میں احادیث کے خلاف عمل کرتے ہیں، آخر

اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کوئی بھی دانستہ طور پر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی نہیں کرتے، تمام ائمہ کرام جملہ امور میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت واجب قرار دیتے ہیں، البتہ جب کسی امام سے کوئی ایسا قول منقول ہو، جو حدیث صحیح کے خلاف ہو، تو اس کی کوئی وجہ ہوتی ہے، ایسے وجوہ واسباب متعدد ہیں:

(۱) اس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ امام کو اس مسئلہ سے متعلق حدیث نہیں ملتی، اس لئے وہ خلاف حدیث فتویٰ دے دیتے ہیں، ائمہ مجتہدین کے جو اقوال احادیث نبویہ کے خلاف ہیں، اکثر وبیشتر اس کی وجہ یہی ہے، اس لئے کہ ائمہ میں سے کوئی بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ جملہ احادیث نبویہ سے آگاہ ہے، خواہ اس کا مقام و مرتبہ کتنا اونچا کیوں نہ ہو۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کوئی حدیث دو طریق سے منقول ہو، ایک طریق صحیح، دوسرا غیر صحیح، کسی امام کو یہ حدیث غیر صحیح سند کے ساتھ پہونچے، وہ اس پر عمل نہ کرے۔ برخلاف دوسروں کے کہ وہ حدیث صحیح سند کے ساتھ اُنہیں پہنچی، یہی وجہ ہے کہ اکثر ائمہ یہ کہتے تھے کہ فلاں مسئلے میں میری یہ رائے ہے۔

(۳) ترک العمل بالحدیث کی تیسری وجہ یہ ہے کہ حدیث ایک ہی سند سے مروی ہو، مگر ائمہ اس کے بارے میں مختلف الرائے ہوں، بعض اس حدیث کو اس لئے صحیح سمجھتے ہوں کہ ان کے نزدیک ان کی سند ومتن پر نقد وجرح کی کوئی گنجائش نہیں، بعض کے

نزدیک اس پر نقد وجرح کا امکان ہے، اس لئے ضعیف ہے اور قابلِ عمل نہیں ہے۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ محدث یا امام کو کوئی حدیث پہنچی ہو اور اس کے نزدیک ثابت بھی ہو، مگر وہ اسے بھول گئے ہوں۔

علماءِ سلف وخلف میں اس کے ان گنت شواہد ملتے ہیں، مثلاً حضرت عمرؓ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا، جو حالت سفر میں جنبی ہو جائے اور اسے پانی نہ مل سکے تو وہ کیا کرے؟ آپؓ نے فرمایا کہ جب تک اسے پانی نہ ملے وہ نماز نہ پڑھے ،حضرت عمار بن یاسرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ امیر المؤمنین! کیا آپ کو یاد نہیں کہ جب ہم دونوں اونٹ کی نگرانی کر رہے تھے اور دونوں پر غسل جنابت لازم ہوا تھا، میں نے تو چوپائے کی طرح مٹی میں لوٹ پوٹ ہو کر نماز ادا کر لی اور آپ نے نماز نہ پڑھی، جب میں نے یہ واقعہ آنحضورﷺ کی خدمت عرض کیا، تو آپﷺ نے فرمایا تھا کہ مٹی میں لوٹ پوٹ کرنے کی ضرورت نہ تھی، صرف یوں کرتے کہ دونوں ہاتھوں کو مٹی پر مار کر اپنے چہرہ اور دونوں ہاتھوں پر پھیر لیتے۔ عمر فاروقؓ نے فرمایا: ''عمار خدا سے ڈرو''! عمار کہنے لگے: ''اگر آپ یہ بات پسند نہیں کرتے تو آئندہ میں اسے بیان نہیں کروں گا'' حضرت عمرؓ نے فرمایا ''ایسا نہیں ہے تم بیان کرتے رہو، اس کی ذمہ داری تمہاری ذات پر ہی عائد ہوتی ہے۔'' (بخاری شریف، کتاب التیمم، باب التیمم ضربة، برقم: ۳۴۷)

(۵) حدیث پر عمل نہ کرنے کی پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی حدیث امام تک پہنچے؛ مگر اس کا خیال ہو کہ اس کا ظاہری معنیٰ مراد نہیں، اس لئے کہ حدیث کا معارض

موجود ہے ،مثلاً عام کا خاص معارض ہے یا مطلق کی مخالفت مقید سے کی جارہی ہو، یا حقیقت کا معارض مجاز کی صورت میں ہو وغیرہ۔

(٦) ترک العمل بالحدیث کی چھٹی صورت یہ ہے کہ امام کو کوئی حدیث پہنچے، مگر وہ کسی دلیل کی بناء پر اس کو منسوخ تصور کرتا ہو، مثلاً حضرت شداد بن اوسؓ اور دیگر صحابہ سے یہ حدیث منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ پچھنہ لگانے والے اور لگوانے والے کا روزہ ٹوٹ گیا۔ (ابوداود، رقم: ۲۳٦۸) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کی وجہ سے منسوخ ہے کہ آپ ﷺ نے روزہ کی حالت میں پچھنہ لگوایا۔ (بخاری شریف رقم: ۱۹۳۸، کتاب الصوم، باب الحجامۃ)

اس سے حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ بعض ائمہ کے یہاں حدیث پر عمل نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ سنت پر طعن کرتے ہیں اور حدیث کو قابلِ استدلال نہیں سمجھتے یا یہ کہ وہ فن حدیث میں کم سواد ہیں۔ بہر حال ائمہ کے ترک العمل بالحدیث کے نمایاں تر اسباب تین ہیں۔

(۱) بعض ائمہ کسی حدیث پر اس لئے عمل نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک سرے سے وہ حدیث نبوی ہی نہیں ہوتی۔

(۲) ان کے خیال میں وہ حدیث زیر بحث مسئلہ سے متعلق نہیں ہوتی، اس لئے وہ اس حدیث کو معمول بہ نہیں ٹھہراتے۔

(۳) وہ حدیث منسوخ ہونے کی وجہ ان کے نزدیک متروک العمل ہوتی ہے۔

(رفع الملام عن الأئمۃ الأعلام لابن تیمیۃ: ۱۳/)

بہر حال احادیثِ صحیحہ پر عمل واجب ہے، چاہے وہ مذاہب و آراء کے خلاف ہی

کیوں نہ ہوں، چناں چہ ائمہ اربعہؒ نے ان لوگوں کی مخالفت کی ہے، جو حدیث کے صحیح ہونے کے باوجود اس کی مخالفت کرتے ہیں، ائمہ اربعہؒ میں سے ہر ایک کا متفقہ فیصلہ ہے ''**إذا صح الحديث فهو مذهبي**'' امام مزنیؒ امام شافعیؒ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: جب تم آقاﷺ کی حدیث کو پاؤ تو تم اس پر عمل کرو اور تم کسی اور چیز کی طرف توجہ مت دو۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ: آقاﷺ کا ہر قول وفعل واجب العمل ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ: مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جنہوں نے حدیث کی اسناد اور اس کی صحت کو پہچانا، اس کے باوجود کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔(الفقہ الاسلامی وادلتہ)

الغرض ان تمام ائمۂ کرام نے ہر قسم کی احادیث صحیحہ کی اتباع پر زور دیا، خواہ اس کا تعلق اخبارِ آحاد سے کیوں نہ ہو۔

دفاعِ دین ہر مسلمان پر ضروری ہے، لہذا بتوفیق ایزدی اسی جذبے کے تحت میں نے ''اخبار آحاد کی استدلالی حیثیت'' کو اپنا موضوع بنایا ہے، اور اس کتاب کا آغاز ایک مقدمہ سے کیا ہے، جس میں سنت کی اہمیت اور سلف کا احادیث کے ساتھ تعلق وغیرہ کا تذکرہ موجود ہے، اس کے بعد بحث کو سات ابواب پر منقسم کیا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے قبول کرے، آمین

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی کتابوں میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے؛ لیکن

میری کوتاہ نظر کے اعتبار سے مستقلا اردو زبان میں اب تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی ہے، ضرورت تھی کہ اس زبان میں بھی کوئی رسالہ یا کوئی کتاب شائع کی جائے تا کہ طالب علم اور حدیث سے ذوق وشوق رکھنے والوں کے لئے مفید ثابت ہو۔

کئی ماہ کی محنت کے بعد جب اسکو مکرمی ومخدومی حضرت مولانا اقبال صاحب ٹنکاروی دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کیا، تو مولانا نے موضوع کی اہمیت اور حقیقت کا احساس کرتے ہوئے مضمون کی تحسین فرمائی، اور تعریفی وتشجیعی کلمات فرمائے۔

اظہار تشکر:

اس موقع پر مکرمی ومخدومی حضرت مولانا اقبال صاحب ٹنکاروی دامت برکاتہم ''استاذ حدیث وفقہ ومہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا بھروچ گجرات'' کا تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں کہ حضرت والا نے اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود کتاب کے تعلق سے وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشورے اور آراء سے رہنمائی فرمائی، نیز اپنی گراں قدر تقریظی اور دعائیہ کلمات کے ذریعہ کتاب کی اہمیت میں اضافہ فرمایا، اللہ تعالی حضرت کی عمر اور علم میں برکت عطا فرمائے، اور حضرت کا سایہ تادیر مع عافیت قائم رکھے۔ آمین.

اسی طرح استاذ محترم حضرت مولانا ارشد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم کا بھی ممنون ومشکور ہوں کہ آپ نے اس سلسلہ میں رہنمائی اور حوصلہ افزائی بھی فرمائی، نیز

مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی صاحب دامت برکاتہم کا بھی ممنون ومشکور ہوں کے آپ نے مسودہ پرنظر ثانی فرمائی اور اپنے قیمتی مشورے سے رہنمائی فرمائی، نیز مولوی یوسف سندراوی اور کاتب عمار صاحب بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کتاب کی کتابت میں ہونے والی اغلاط کی اصلاحات وترمیمات کی زحمت کو برداشت کیا، اللہ تعالی ان سب حضرات کو اپنی شایان شان دارین میں بہترین بدلہ عطا فرمائے۔آمین.

اخیر میں اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس کتاب کو قبول فرما کر طلبۂ حدیث کے لئے نافع بنائے اور اس خدمت کو راقم اور اس کے والدین واساتذہ کے لئے صدقۂ جاریہ ونجات اخروی کا ذریعہ بنائے۔آمین۔

فقط

محمد عبداللہ لاجپوری

خادم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ

ماٹلی والا بھروچ، گجرات

۳۰/ ذوالقعدہ ۱۴۳۶ھ، ۱۵/ستمبر ۲۰۱۵ء

آپ ﷺ کی اطاعت واتباع واجب ہے
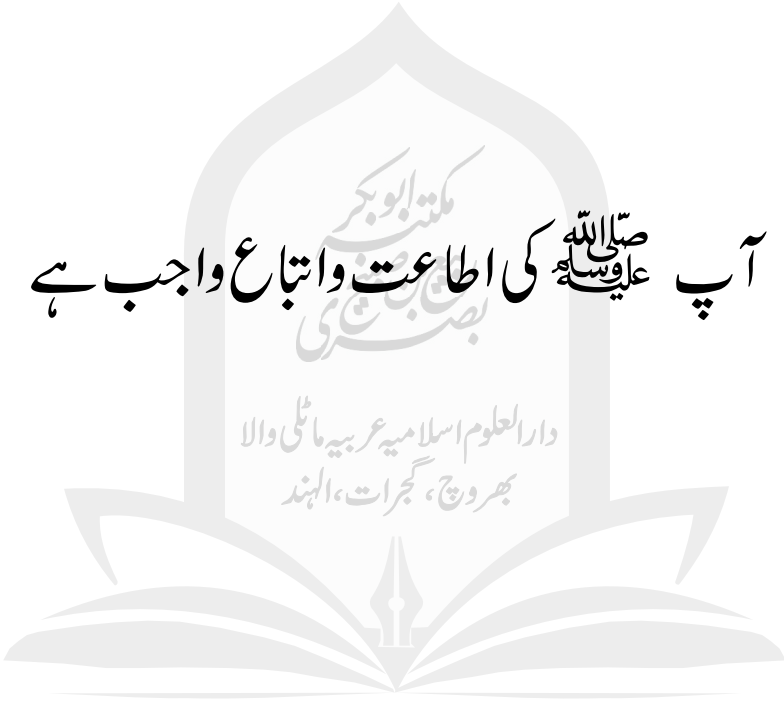
آپ ﷺ کی اتباع واجب ہے: ارشاد ربانی ہے: ﴿ربنا وابعث فیهم رسولاً منهم یتلوا علیهم آیاتک ویعلمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم﴾ (البقرۃ:۱۲۹)

ترجمہ: اے پروردگار ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ پڑھیں ان پر تیری آیتیں اور سکھلاوے ان کو کتاب اور تہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو۔

قرآن کریم کی یہ آیت آپ ﷺ کے چار وظائف بیان کرتی ہے:

(۱) قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے طریقہ میں آپ ﷺ کا طرز حجت ہے۔

(۲) کتاب اللہ کی تشریح کے بارے میں آپ ﷺ کی بات حرفِ آخر ہے۔

(۳) دینی رہنمائی پر مبنی حکمت سیکھنے کے لئے آپ ﷺ کی ذات واحد سرچشمہ ہے۔

(۴) تعلیماتِ خداوندی کو بروئے عمل لانے کے لئے لوگوں کی عملی تربیت کا فریضہ آپ ﷺ کو سونپا گیا ہے۔

ان احکام کے سلسلہ میں قرآن حکیم نے دو مختلف اصطلاحیں استعمال کی ہے: ایک ''اطاعت'' اور دوسری ''اتباع''، پہلی اصطلاح کا تعلق آپ کے احکامات وارشادات سے ہے، جبکہ دوسری کا تعلق آپ کے افعال واعمال سے، ان دونوں (اطاعت واتباع) پر قرآن نے زور دیا ہے، حتیٰ کہ اطاعت رسول کو اللہ کی

اطاعت کے ساتھ ذکر کیا، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿قل أطيعوا الله والرسول فإن تولوا فإن الله لايحب الكٰفرين﴾. (آل عمران:۳۲)

ترجمہ: کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو پھر بھی اگر منہ موڑوں گے تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

﴿وأطيعوا الله والرسول لعلكم ترحمون﴾.(آل عمران:۱۳۲)

ترجمہ: اور اللہ اور رسول کی بات مانو تاکہ تم سے رحمت کا برتاؤ کیا جائے۔

نیز اور بھی اس مفہوم کی بے شمار آیات موجود ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جہاں اللہ کی اطاعت کا ذکر ہے، وہاں رسول کی اطاعت کا بھی ذکر ہے، اس کے برعکس ایسی کئی آیات ہیں کہ ان میں رسول کی اطاعت کا تو ذکر ہے، اللہ کی اطاعت کا کوئی حوالہ نہیں، چنانچہ مذکور ہے:

﴿وأقيموا الصلوٰة وآتوا الزكٰوة وأطيعوا الرسول لعلكم ترحمون﴾. (النور:۵۶)

ترجمہ: اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور رسول کی فرمابرداری کرو تاکہ تمہارے ساتھ رحمت کا برتاؤ کیا جائے۔

نیز ﴿إن تطيعوه تهتدوا﴾ (النور:۵۴) ترجمہ: اگر تم ان کی فرمابرداری کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿يومئذ يود الذين كفروا وعصوا الرسول لو تسوّى بهم الأرض﴾. (النساء:۴۲)

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر اپنا رکھا ہے اور رسول کے ساتھ نافرمانی کا رویہ اختیار کیا ہے اس دن وہ یہ تمنا کریں گے کہ کاش انہیں زمین کے برابر کر دیا جائے۔

اطاعتِ رسول کو اس قدر اہمیت کے ساتھ ذکر کرنے کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ عملاً اللہ کی اطاعت اس کے بغیر ممکن نہیں ہے، یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جہاں اطاعت رسول کا ذکر ہے اور اطاعت اللہ کا نہیں، وہ بغیر ذکر کئے اس میں شامل ہے؛ کیوں کہ اطاعتِ رسول درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت ہے۔

دوسری اصطلاح ''اتباع'' ہے، قرآن مجید میں ہے: ﴿قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله﴾. (آل عمران:۳۱)

ترجمہ: اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ سے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

نیز ارشاد ہے: ﴿الذين يتبعون الرسول النبي الأمي﴾. (الأعراف:۱۵۷)

ترجمہ: جو اس رسول یعنی نبی امّی کے پیچھے چلیں۔

اور ایک جگہ ہے: ﴿يأيها النبي حسبك الله ومن اتبعك من المؤمنين﴾. (الأنفال:۶۴)

ترجمہ: اے نبی! تمہارے لئے تو بس اللہ اور وہ مؤمن لوگ کافی ہیں جنہوں نے تمہاری پیروی کی ہے۔

یہ تمام آیات آپ ﷺ کی اتباع پر زور دے رہی ہیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ محض نظریاتی تعلیم کسی قوم کی اصلاح کے لئے کافی نہیں ہوا کرتی، اصلاح کا فطری طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے ایک عملی نمونہ موجود ہو، جس کی وہ اتباع کریں، اسی طرح محض نظریاتی تعلیم کسی شخص کو علم کا ماہر نہیں بنا سکتی، تاوقتیکہ اس علم یا فن کے کسی اچھے ماہر کے زیرِ تربیت نہ رہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف آسمانی کتاب نازل کرنے پر اکتفاء نہیں کیا؛ بلکہ اس کے ساتھ ہمیشہ کوئی پیغمبر ضرور بھیجا، ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ پیغمبر بھیجا گیا کوئی نئی کتاب ہمراہ نہیں آئی؛ لیکن ایسا نہیں ہوا کہ کسی آسمانی کتاب کا نزول کسی پیغمبر کے بغیر ہوا ہو، کفارِ مکہ نے مطالبے بھی کئے کہ صرف کتاب کا نزول ہو، نبی کی ہمیں ضرورت نہیں؛ لیکن ان کے مطالبے کو مسترد کر دیا گیا، اس لئے کہ انسانیت کے لئے صرف کتاب کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ ایک معلم کی بھی ضرورت تھی، اسی لئے آپ ﷺ کو اس طرح بھیجا گیا کہ آپ ﷺ کی اتباع و اطاعت واجب قرار دیا گیا۔ (حجیتِ حدیث:۱۰)

سنت کی عظمت اور حدیث ومحدثین کی فضیلت

سنت رسول اللہ ﷺ مجموعۂ ہدایت اور شریعت کا بنیادی مصدر وسر چشمہ ہے، جو آپ ﷺ سے امت کو حاصل ہوا۔

اور اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو آپ ﷺ کے احترام کا حکم دیا ہے، نیز ان لوگوں کی تعریف کی ہے، جو اپنی آواز کو آپ ﷺ کے پاس پست کر دیتے تھے، جب آپ ﷺ کے احترام کا حکم ہے، تو لازمی طور پر آپ کے اقوال وافعال اور آپ ﷺ کے تقررات کے احترام کا حکم ہوگا، یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام نے سنت کا بہت ہی زیادہ احترام کیا ہے۔

عمرو بن میمون، ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک دن حدیث بیان کی اور ان کی زبان پر یہ لفظ جاری ہوا: قال رسول اللہ ﷺ، راوی فرماتے ہیں کہ ان پر خوف طاری ہو گیا، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ پسینہ ان کی پیشانی سے ٹپک رہا تھا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ان کی آنکھیں اشکبار ہونے لگیں اور رگیں پھولنے لگیں۔

اسی طرح ابن سیرین کے بارے میں ہے کہ وہ مسکراتے رہتے تھے: لیکن جیسے ہی ان کے پاس کوئی حدیث ذکر کی جاتی، تو ان پر خوف طاری ہو جاتا۔

نیز امام مالکؒ کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ درس حدیث کا ارادہ فرماتے تو غسل کرتے، خوشبو لگاتے، نئے کپڑے زیب تن فرماتے، عمامہ پہنتے۔ الغرض ایک مخصوص شان اختیار فرماتے، اور جب تک درس حدیث سے فارغ نہ ہوجاتے، درسگاہ عود سے معطر رہتی تھی، اور کہا کرتے تھے کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ آقا ﷺ کی احادیث کی تعظیم کروں اور اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ کھڑے ہوکر یا جلد بازی میں احادیث بیان کروں۔ (کتاب الشفاء: ج۲/۳۵)

یہ تمام وہ چیزیں ہیں جو بطور تعظیم واحترام کے ان سے صادر ہوئیں، نیز یہ تعظیم ہے ان الفاظ شرعیہ کی، جو اس ذات سے تعلق رکھتے ہیں کہ جس کا کلام سب سے اعلیٰ اور معزز تھا اور جسے جوامع الکلم دیے گئے۔ (بخاری شریف: برقم ۲۹۷۷)

اللہ تعالیٰ نے علم حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے اور علماء کی تعریف بیان کی ہے اور اپنی گواہی کے ساتھ ان کی گواہی کا ذکر کیا ہے، نیز اہل علم اور غیر اہل علم کے درمیان مساوات کی نفی فرمائی ہے۔ (سورۃ الزمر: ۸)

اسی طرح آقا ﷺ نے بھی علم حاصل کرنے کی ترغیب دی اور بتایا کہ اس کے حاملین ورثۃ الانبیاء ہیں اور طالبانِ علومِ نبوت کے لیے ملائکہ اپنے پروں کو بچھا دیتے ہیں، چنانچہ جو شخص علمِ حدیث میں مشغول ہوگیا، اس کے لئے اس مدح کا ایک حصۂ وافر ہے اور وہ تمام فضیلتیں جو علماء کو حاصل ہیں، اسے بھی حاصل

ہوں گی۔

علم حدیث اورقرآنی ارشادات:

(۱)﴿ثم إن علينا بيانه﴾.(القیٰمۃ:۱۹)ترجمہ: پھراس کی وضاحت بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

(۲)﴿لتبين للنا س ما نزل إليهم ﴾.(النحل:۴۴)ترجمہ: تاکہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کردو جوان کے لئے اتاری گئی ہے۔

(۳)﴿وما ينطق عن الهوىٰ إن هو الا وحي يوحىٰ﴾ . (النجم:۳)
ترجمہ: یہ تو خالص وحی ہے جوان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔

(۴)﴿ما آتا كم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا﴾
(الحشر:۷) ترجمہ: اور جو دے کچھ تم کو رسول وہ لےلواور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

(۵)''وأمابنعمة ربک فحدث .''(الضحیٰ:۱۱)ترجمہ: اورتمہارے پروردگار کی نعمت ہے اس کا تذکرہ کرتے رہنا۔

فضائل علم حدیث اوراحادیثِ مبارکہ:

(۱)عن أنس رضی الله عنه عن النبیﷺ قال:'' نضر الله عبداً سمع مقالتی فوعاها، ثم بلغها عنی، فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الیٰ

من هو أفقه منه". (سنن ابن ماجہ، باب من بلّغ علماً، رقم:۲۳۶)

اس حدیث میں بالأخص علم حدیث کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس کے ذریعہ آپ ﷺ نے اس شخص کو دعا دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات کو سن کر محفوظ رکھا اور اس کو دوسروں تک پہونچایا، کیوں کہ بہت سے حامل فقہ فقیہ نہیں ہوتے ہیں اور بہت سے حامل فقہ سننے والے سے زیادہ سمجھ دار اور فقیہ ہوتے ہیں۔

(۲) عن ابن عباسؓ عن النبي ﷺ قال: "اللهم ارحم خلفائي، قلنا: من خلفاؤك يا رسول الله؟ قال: الذين يروون أحاديثي ويعلمونها الناس". (رواہ الطبرانی فی الأوسط، برقم:۵۸۴۶)

ترجمہ: آپ ﷺ نے فرمایا، اے اللہ! میرے جانشیں پر رحم فرما، صحابہؓ نے دریافت کیا، اے اللہ کے رسول ﷺ آپ کے جانشیں کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: میرے جانشیں وہ ہیں، میری حدیثوں کو بیان کریں گے اور لوگوں کو ان کی تعلیم دیں گے، (گویا مشتغلین بالحدیث آپ کے جانشیں ہیں)۔

(۳) عن ابن مسعودؓ عن النبي ﷺ قال: "إن أولىٰ الناس بي يوم القيامة أكثرهم عليّ صلوة". (ابن حبان، برقم:۹۰۸)

ترجمہ: مجھ سے سب سے زیادہ قریب قیامت کے دن وہ شخص ہوگا، جو مجھ

پر سب سے زیادہ درود شریف پڑھنے والا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ چونکہ یہ توفیق علمِ حدیث سے اشتغال رکھنے والوں کو عطا فرماتے ہیں، لہٰذا ان کو خاص قرب حاصل ہوگا۔

احادیث کی اہمیت:

علماء نے جہاں مصدرِ شرعی پر "**سنة رسول الله ﷺ ومكانتها**" کے عنوان سے کتابیں لکھی ہیں، وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن مجید حدیث کا جتنا محتاج ہے خود حدیث پاک قرآن مجید کی اتنی محتاج نہیں ہے، جیسا کہ امام اوزاعی (م: ۱۵۷ھ) کا قول ہے: "**الكتاب أحوج الى السنة من السنة الى الكتاب**". (السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي: ص/۴۲۳)

قرآن مجید محتاج ہے اور احادیث محتاج الیہا، لیکن یہ احتیاج باعتبار تبیین وتشریح ہے نہ کہ وہ احتیاج جو متن وشرح کے درمیان باعتبار وجود واصل کے ہوتی ہے، اسی کی جانب اشارہ کیا ہے امام صاحبؒ نے اپنے اس قول سے: "**لولا السنة ما فهم احد منا القرآن**". (مباحث في الحديث وعلومه: ص/۱۳۷)

احادیثِ نبویہ افضل ہے باعتبار موضوع کے بھی، کیونکہ یہ کلام مشکوۃ نبوت یعنی قلبِ مزکیٰ ومصفیٰ سے نکلا ہوا ہے اور آپ ﷺ کا قلبِ اطہر اس کا مصدر ومنبع ہے، لہٰذا یہ کلام بھی کلامِ نورانی ہوگا۔

حدیث نبوی کے حصول کا اہتمام اور سلف

صحابہؓ نے اس علم کی اہمیت کو پہچانا اور اس کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرنے لگے، چناں چہ انہوں نے آپ ﷺ کی مجلس کو لازم پکڑے رکھا، یہاں تک کہ بعض وہ حضرات جو مجلسِ نبوی میں حاضر نہیں ہو پاتے، وہ حاضر ہونے والے سے پوچھتے رہتے تھے کہ آقا ﷺ نے کیا بات ارشاد فرمائی، چناں چہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے پڑوسی انصاری صحابیؓ کے ساتھ باری مقرر کر لی تھی، ایک دن وہ حاضر ہوتے دوسرے دن حضرت عمرؓ مجلس میں شرکت کرتے۔ (بخاری شریف: کتاب العلم، رقم: ۸۹)

اسی طرح صحابہٴ کرام آپ ﷺ سے مجلسوں میں اور منبروں پر علم حاصل کرتے تھے، کبھی سفر میں، تو کبھی حضر میں، یہاں تک کہ وہ تمام چیزیں انہوں نے آپ ﷺ سے حاصل کیں جن کی ضرورت تھی، ترمذی شریف کی روایت ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کچھ یہودیوں نے ازراہِ مذاق کہا کہ تمہارے نبی ﷺ تمہیں ہر چیز سکھاتے ہیں یہاں تک کہ بول و براز کا طریقہ بھی؟ تو انہوں نے کہا: جی ہاں، (اور یہ کوئی مذاق کی چیز نہیں، بلکہ جامعیت کی دلیل ہے)۔ (ترمذی: باب الاستنجاء بالحجارۃ، رقم: ۱۶)

صحابہٴ کرام نے صرف نبی کریم ﷺ سے حصولِ علم پر قناعت نہیں کیا بلکہ یہ ذمہ داری سمجھی کہ جس علم کو انہوں نے آقا ﷺ سے حاصل کیا ہے، یہ ایک عظیم امانت ہے اور ہمارے ذمہ ضروری ہے کہ ہم دوسروں تک اسے پہونچائیں، ورنہ ہم کتمان علم کی وعید کے مستحق ہوں گے، چناں چہ انہوں نے اس علم کی نشر و اشاعت میں ہر قسم کی جد

وجہد صرف کی، اور دور دراز کے سفر کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا، حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ مجھے کسی حدیث کے متعلق پتہ چلتا کہ فلاں صحابی کے پاس ہے، تو میں ان کے یہاں جاتا اور دروازہ کے پاس بیٹھ جاتا، ہوائیں چہرہ پر گرد وغبار اڑا کر لگاتیں جس سے میں بیدار رہوتا۔ (مستدرک حاکم، ۱:۱۰۲ و ۳:۵۳۸)

اسی طرح حضرت جابرؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے شام کا سفر کیا تا کہ عبداللہ بن انیسؓ سے ایک حدیث حاصل کریں۔ (جامع بیان العلم وفضلہ: ۱۲۷)

اسی طرح حضرت ابوایوبؓ نے ایک شہر کا سفر صرف اسی لئے کیا کہ حضرت عقبہ بن عامرؓ سے ایک حدیث حاصل کریں۔ (مسند احمد: ۳/ ۴۹۵)

صحابۂ کرام احادیث کی سماعت کے بعد آپس میں ان کا مذاکرہ کرتے تھے، یہاں تک کہ برابر محفوظ کر لیتے، نیز ان کو یاد رکھنے کے لیے مستقل وقت مقرر کرتے تھے، چناں چہ حضرت ابو ہریرہؓ رات کا ایک حصہ مقرر کر لیتے تا کہ وہ اپنی حدیث کو یاد رکھ سکیں۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۸/ ۱۱۹)

خلاصۂ کلام یہ کہ ہمارے اسلاف نے حدیث کی طرف بڑی توجہ دی اور اس کے حصول کا بڑا اہتمام کیا۔ (جزاھم اللہ عنا للاسلام خیر الجزاء)

حفاظتِ حدیث اور علماء کی جدوجہد

صحابہ کے اخیر زمانہ میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے، جو جان بوجھ کر آقاﷺ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے لگے، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اس پر کیا وعیدیں وارد ہوئی ہیں اور واضعینِ حدیث میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کا مقصد صحیح عقیدہ میں فساد اور اسلام میں شکوک وشبہات پیدا کرنا تھا۔

کچھ دوسرے وہ لوگ بھی تھے جنہیں قرآن پاک میں، ﴿من الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعاً﴾ سے تعبیر کیا گیا، ان کا مقصود تعصب تھا۔

تیسری قسم ان قصہ گو کی تھی، جن کا مقصد کثرت مرویات اور ایسی عجیب وغریب حکایات بیان کرنا تھا، جو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے؟

لیکن بروقت علماء نے خطرہ کا احساس کرلیا تو انہوں نے اس فتنہ کا جم کر مقابلہ کیا اور اس کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی تاکہ حدیث نبوی ہر قسم کی کدورت اور مکروفریب سے محفوظ رہے، چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے چند احتیاطی تدبیر اختیار کیں، تاکہ وضعِ حدیث کی وباء ختم ہو، مثلاً:

(ا) اسانید کا التزام اور رواۃ کے اسماء، اور یہ اس امت کے خصائص میں سے ہیں اور اسی سے وہ مصدر حدیث اور مرتبۂ رجال کو پہچانتے تھے اور اس کے قبول ورد کا فیصلہ کرتے تھے۔ عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: ''**لولا الاسناد لقال من شاء ماشاء**'' (مسلم شریف:۱/۸۷) (اگر اسناد نہ ہوتی تو جس کے دل میں جو آتا وہ کہتا) اس کا اثر

یہ ہوا کہ بہت سے لوگ وضعِ حدیث سے رک گئے اور ان کو یہ خوف محسوس ہوا کہ کہیں ہمارا کذب ظاہر نہ ہو جائے اور ہمارا مرتبہ گھٹ نہ جائے۔

(۲) احوال رواۃ کے بارے میں تتبع اور حدیث میں ان کے مقام واہلیت تحمل کے سلسلہ میں بحث وتحقیق۔

(۳) روایت میں تثبت باعتبار تحمل واداء:

اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے حدیث نبوی کو موضوع سے ممتاز کر دیا، اور کذابین کو پہچان لیا، جس کے ذریعہ انہوں نے ان کی حالت لوگوں کے سامنے بیان کی، اور وہ پوشیدہ باتیں جو وہ علماء اعلام سے چھپانا چاہتے تھے واشگاف کر دیا، سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حدیث کے بارے میں جھوٹ بولنے والے کی پردہ پوشی نہیں کی۔ (فتح المغیث :۱/۱۳۰)

تاریخ تدوین حدیث

عہدِ رسالت میں احادیث کی تدوین:

چونکہ قرآن مجید کے الفاظ اور معانی دونوں مطلوب تھے، لہذا قرآن غیر قرآن سے مخلوط نہ ہو، نیز اس زمانہ میں حافظے قوی تھے، اس لئے اولاً کتابتِ حدیث کی طرف توجہ نہیں دی گئی؛ لیکن اس مصلحت وقتی کے باوجود آپ ﷺ نے موقع بموقع کتابت حدیث کی ہدایت فرمائی، چنانچہ:

(۱) امام ترمذی نے ابو ہریرہؓ کی ایک روایت ذکر کی ہے کہ آپ نے ایک انصاری صحابیؓ کو حکم دیا: "**استعن بیمینک**". (ترمذی کتاب العلم، باب ماجاء فی الرخصۃ فیہ، رقم:۲۶۶۶)

ترجمہ: اپنے دائیں ہاتھ سے مدد حاصل کرو اور لکھو۔

(۲) عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فریضۂ زکوٰۃ کے متعلق شریعت کے احکام تفصیلی طور پر املا کروائے تھے۔ (ابوداؤد شریف، باب فی زکوٰۃ السائمۃ رقم:۱۵۶۸)

(۳) نیز آپ ﷺ نے عبداللہ بن عمرو سے فرمایا: "**قیدوا العلم**". "علم کو محفوظ کرو" انہوں نے فرمایا: **وما تقییدہ**؟ اس کی حفاظت کیسے کی جاسکتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "**کتابتہ**" لکھ کر کے (مستدرک حاکم، رقم:۳۶۲)

یہ چند سرسری مثالیں ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آپ ﷺ نے حدیثیں لکھوائیں اور صحابہؓ کو لکھنے کی ہدایت فرمائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ رسالت ہی میں احادیث کا ایک عظیم ذخیرہ کتابت کی شکل میں موجود تھا۔

عہدصحابہ میں احادیث کی تدوین:

صحابہ میں کتابت حدیث کے سلسلہ میں دوطرح کی رائےتھی ابتداء ممانعت کی وجہ سے کچھ صحابہ احتیاط برتتے تھے، جیسے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓاور علیؓ چنانچہ:

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے پاس پانچ سوروایات لکھی ہوئی تھیں، لیکن آپ نے انہیں جلا ڈالا۔(تذکرۃ الحفاظ:۱/۵)

(۲) حضرت عمر فاروقؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کیا احادیث جمع کی جائیں؟ اس موضوع پر ایک مدت تک استخارہ کرتے رہے اور آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ جمع نہ کی جائے، اس لئے کہ مجھے پچھلی امتوں کے حالات معلوم ہیں، جس کے پاس نوشتے تھے، انہوں نے اسی پر توجہ مرکوز رکھی اور کتاب کو چھوڑ دیا۔(جامع بیان العلم وفضلہ:۸۹)

(۳) سیدنا حضرت علیؓ کے پاس صحیفہ موجود تھا، اس کے باوجود اگر کسی کے متعلق پتہ چلتا تھا کہ ان کے پاس نوشتہ ہے، تو آپ اس کو مٹا دینے کا حکم فرماتے تھے۔(جامع بیان العلم وفضلہ:۸۸)

اور بعض صحابہ بڑے احتیاط کے ساتھ لکھتے تھے، جن کا تذکرہ خطیب بغدادی نے کیا ہے۔(تقیید العلم:۸۸-۱۳۷) نیز دیکھیں کہ:

(۱) امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت انسؓ کے مکتوب کا ذکر کیا ہے۔(بخاری شریف، باب زکوٰۃ الغنم:رقم:۱۴۵۴)

(۲) امام ترمذیؒ نے باب الیمین مع الشاہد کے ذیل میں سعد بن عبادہؓ کے صحیفہ کا

ذکرکیا ہے۔(ترمذی شریف،رقم:۱۳۴۳)

(۳)مسلم شریف میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کامکمل متن موجود ہے جومناسک حج پرمشتمل ہے۔(مسلم شریف،باب حجۃ النبی ﷺ،رقم:۱۲۱۸)

عہدتابعین میں احادیث کی تدوین:

بعض صحابہ کی طرح تابعین کی ایک جماعت بھی ابتداء کتابت حدیث کو پسند نہیں کرتی تھی، جیسے: ابراھیم بن یزید تیمی (م:۲۹ھ)،ابراھیم بن یزید نخعی (م:۹۶ھ)، عامر شعبی (م:۱۰۳ھ)وغیرہ۔(تقیید العلم:۴۶)

لیکن دوسری جانب سعید بن جبیر (م:۹۵ھ)،سعید بن المسیب (م:۹۴ھ)، عطاء بن رباح (م:۱۱۴ھ)وغیرہ نے باقاعدہ حدیث کی کتابت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی۔(تقیید العلم:۱۰۱،مسند دارمی،۱/۱۳۶)

چنانچہ تابعین کےزمانے کے کچھ نوشتے پائے جاتے ہیں،امام ترمذیؒ نے کتاب العلل میں ایسے تابعین کا ذکر کیا ہے، جو کتابتِ حدیث کیا کرتے تھے،ان تابعین کی جماعت میں سرفہرست ابن شہاب زہری (م:۱۲۴ھ) ہیں جو حدیث کے مدونِ اول سمجھے جاتے ہیں ان کے علاوہ ابوزبیر محمد بن مسلم (م:۱۲۹ھ)،(جوحضرت جابرؓ کے تلمیذ ہیں)،ابوعدی زبیر بن علی الھمدانی (م:۱۳۱ھ)،اسامہ بن مالک (م:۱۳۵ھ)،ایوب سختیانی (م:۱۳۱ھ)، ہشام بن عروہ (م:۱۴۶ھ)،اورحضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے والد عبدالعزیز بن مروان ہیں،جنھوں نے بھی احادیث کی جمع وتدوین کی کوشش کی تھی۔

(الطبقات الکبریٰ، ۸/۷)

دوسری صدی ہجری میں تدوین حدیث:

حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب ''تهذيب التهذيب ''میں لکھا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں بھی نوشتوں کا ذکر ملتا ہے، اس لئے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے با قاعدہ تدوین حدیث شروع ہوچکی تھی، جس کے ذیل میں ابن شہاب زہری اور امام ابوحنیفہؒ کا شمار کیا جاتا ہے۔

اس دور میں احادیث کو باقاعدہ کتابی شکل دی جانے لگی، چنانچہ حافظ سیوطیؒ اپنی کتاب ''تبييض الصحيفة في مناقب أبي حنيفة'' میں لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے ابواب علمیہ کے اعتبار سے احادیث کو جمع کرنے والے امام صاحبؒ ہیں۔ (تبییض الصحیفہ :۱۲۹)

اس دور میں اور بھی متعدد اہلِ علم حضرات کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے تدوینِ حدیث کا بیڑا اٹھایا، مثلاً ابن جریج (م:۱۵۰ھ)، محمد بن اسحٰق (م:۱۵۱ھ)، معمر بن راشد (م:۱۵۳ھ)، ربیع بن صبیح (م:۱۶۰ھ)، سعید بن ابی عروبہ (م:۱۵۶ھ)، عبد الرحمٰن بن عمرو اوزاعی (م:۱۵۷ھ)، شعبہ بن الحجاج (م:۱۶۰ھ) وغیرہ، اس دور میں جو خاص کتابیں تصنیف ہوئیں ان کا نام موطا یا سنن یا مصنف یا جامع ہوا کرتا تھا۔

تیسری صدی ہجری میں تدوین حدیث:

تیسری صدی ہجری وہ زمانہ ہے جس میں تدوین وتالیف اور تنقیح احادیث کا

ذوق عروج پر تھا، اور فقط احادیثِ مرفوعہ پر مشتمل کتابیں لکھی جانے لگیں، جن کی ترتیب عموماً مسانید صحابہ پر رکھی گئی، مثلاً مسند ابی داود الطیالسی (م:۲۰۴ھ)، مسند محمد بن یوسف الفریابی (م:۲۱۲ھ)، مسند الحمیدی (م:۲۱۹ھ)، مسند امام احمد (م:۲۴۱ھ)، مسند بزار (م:۲۹۲ھ)، مسند ابی یعلیٰ (م:۳۰۷ھ)، الغرض تیسری صدی ہجری کے تقریباً ۳۵ مسانید کا ذکر ملتا ہے۔(الرسالۃ المستطرفۃ:۶۰،تخریج الحدیث نشأتہ ومنہجیتہ:۹۱)

اول من صنف مسندا:

''مسند'' کی تالیف سب سے پہلے کس نے کی؟ اس سلسلہ میں متعدد اقوال ملتے ہیں:

(۱) حاکم ابوعبداللہ نیشاپوری فرماتے ہیں کہ عبید بن موسیٰ العبسی ہیں۔

(۲) امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ نعیم بن حماد ہیں۔

(۳) خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ اسد بن موسیٰ ہیں۔

(۴) ابن عدی فرماتے ہیں کہ مسدد بن مسرہد ہیں۔

(۵) بعض حضرات کے نزدیک ابوداؤد طیالسی ہیں۔

ان اقوال میں تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ باعتبار رجال علیٰ ترتیب حروف الہجاء اول من صنف مسنداً عبید اللہ بن موسیٰ العبسی اور ابوداؤد الطیالسی ہیں، اور شہر کوفہ میں یحییٰ الحمانی ہیں اور بصریٰ میں مسدد ابن مسرہد ہیں اور مصر میں اول من صنف مسنداً

اسد بن موسیٰ ہیں۔ (الرسالۃ المستطرفۃ:۵۳)

تکمیل تدوین:

تیسری صدی کا آخر تدوین کے کمال کا دور ہے، جس میں محدثین نے اپنے اپنے ذوق کے اعتبار سے تنقیح کے ساتھ مختلف طریقوں سے احادیث کو جمع کیا، اسی دور میں مشہور کتبِ ستہ (۱) صحیح بخاری (۲) صحیح مسلم (۳) سنن نسائی (۴) سنن ابی داؤد (۵) سنن ترمذی اور (۶) سنن ابن ماجہ وجود میں آئیں۔

سادس ستہ کی تعیین میں اختلاف ہے:

(۱) مشارقہ کے یہاں سادس ستہ سنن ابن ماجہ ہیں، (۲) مغاربہ کے یہاں سادس ستہ موطا الامام مالکؒ ہیں، (۳) بعض نے سنن دارمی کو سادس ستہ قرار دیا ہے۔

(الامام ابن ماجہ وکتابہ السنن:۱۸۰-۱۸۷)

پہلا باب

خبر: تعریف واقسام

خبر:تعریف واقسام

خبرِلغوی:"الخبر مأخوذ من الخبار من الارض مالان واسترخی وکانت فیه حجرة" خبرمشتق ہے خبار سے،جس کے معنیٰ ہے پتھروں والی نرم زمین،اوراسی سے حدیث ہے:"نهٰی من المخابرة". (بخاری شریف،رقم:۲۳۸۱)اورمثل بھی مشہورہے:"من تجنب الخبار أمن العثار".(لسان العرب:۴/ ۲۲۸)ترجمہ: پتھریلی زمین پراحتیاط کےساتھ چلنے والاٹھوکرسے محفوظ رہتا ہے۔

خبرِ اصطلاحی: بعض حضرات کے نزدیک حدیث اورخبردونوں ایک ہی چیز ہے ،لہذاانکے نزدیک حدیث اورخبرمیں تساوی کی نسبت ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ:اقوال نبی اورمتعلقات نبی کوحدیث کہتے ہیں اوراخبار ملک وملوک کوخبرکہتے ہیں۔گویاان کےنزدیک حدیث وخبرمیں تباین کی نسبت ہے۔

بعض کے نزدیک حدیث اورخبر میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے، یعنی حدیث خاص ہےاقوال نبی کےساتھ اورخبرعام ہے،اقوال نبی اوراخبارملوک کوبھی خبر کہتے ہیں۔(نزہۃ النظر:۶۸)

خبرکی تقسیم باعتبارِاتصال:

صحابہؓ نے آقاعلیہﷺ سے علوم واخبارکواخذکیا،ان سے تابعین نے،ان سے تبعِ

تابعین نے، یہاں تک کہ یہ علوم علمائے امت تک پہنچے اورانہوں نے اپنی اپنی تالیفات میں ان کوجگی دی، اور یہ تالیفات بغیر نقص وتغیر کے ہم تک پہنچی، اس کے بعد محدثین و اصولیین نے تتبع اور چھان بین کے بعداخبار کی دوقسمیں کیں، ایک قسم وہ ہے جس کے روایت کرنے والے اتنے ہوں، جن کا جھوٹ پر اتفاق کرنا محال ہو، دوسری قسم وہ ہے جن کوروایت کرنے والے اتنی تعداد میں نہ ہوں، اول کو''متواتر'' اور ثانی کو'' آحاد'' کہتے ہیں۔

یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ یہ تقسیم صحابہ وتابعین کے زمانے کی نہیں ہے؛ بلکہ محدثین واصولیین کی پیدا کردہ ہے، حنفیہ نے مزید قسم کا اضافہ کیا ہے، جس کو''مشہور'' کہتے ہیں۔

متواتر:تعریف اورشرائط

تواترِلغوی: تواتر لغت میں تتابع کے معنیٰ میں آتا ہے، یعنی یکے بعد دیگرے آنا، اوراسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ثم أرسلنا رسلنا تترا﴾. جو''وتر'' سے مأخوذ ہےاوراس کے معنیٰ ہیں کہ ہر ایک علاحدہ علاحدہ یکے بعد دیگرے آئے۔

متواتر اصطلاحی: وہ حدیث ہے، جس کی سندیں بکثرت ہوں اور کثرت کے لئے کوئی تعداد متعین نہیں ہے، جیسے: **من كذب عليّ متعمدا فليتبوأ مقعده من النار** . (مسلم ، باب تغليظ الكذب على رسول اللهﷺ ، رقم : ۳) اس کو**۶۲** یا **۱۰۰** سے زیادہ لوگوں نے بیان کیا ہے۔

شرائط تواتر: تواتر کے لئے پانچ شرطیں ہیں: (۱) سندوں کی کثرت ۔ (۲) روات کی تعداد اتنی ہو کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا یا اتفاقاً ان سے جھوٹ کا صادر ہونا محال ہو۔ (۳) سندوں میں ابتداء سے انتہاء تک ہر طبقہ میں روات کی یہ کثرت باقی ہو۔ (۴) روایت کا منتہی کوئی امر حسّی ہو۔ (یعنی آخری راوی کسی بات کا سننا یا کسی بات کا دیکھنا بیان کرے) (۵) ان روات کی خبر سے سامع کو علم یقینی حاصل ہو۔

تنبیہ: اس پانچویں شرط کو بعض لوگوں نے متواتر کا فائدہ کہا ہے۔

حکم متواتر:

(۱) جمہور کی رائے یہ ہے کہ علم یقینی بدیہی حاصل ہوتا ہے۔

(۲) اشاعرہ میں سے امام حرمین (م: ۴۷۸ھ) اور معتزلہ میں سے ابوالحسن بصری (م: ۴۳۶ھ) اور کعبی (م: ۳۱۹ھ) کا مذہب یہ ہے کہ علم نظری کا فائدہ دیتی ہے۔

(۳) امام غزالیؒ (م: ۵۰۵ھ) کا قول یہ ہے کہ نہ بدیہی کا فائدہ دیتی ہے نہ نظری کا بلکہ بین بین کا فائدہ دیتا ہے۔

(۴) علامہ آمدی (م: ۸۵۲ھ) نے اس بارے میں توقف کیا ہے۔ (المستصفیٰ: ۱/۱۳۲، احکام آمدی: ۱/۲۰۸)

ابن حجرؒ نے شرح نخبہ میں اول الذکر دونوں قول کو ذکر فرمایا ہے اور دوسرے قول

کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے اس لئے کہ نظر کہا جاتا ہے امور معلومہ یا امور مظنونہ کو اس طرح ترتیب دینے کا، جس سے نامعلوم چیز کا ظن حاصل ہو جائے؛ لہٰذا عام لوگوں میں نظر وفکر کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے؛ حالانکہ متواتر سے علم ان لوگوں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ متواتر سے حاصل ہونے والا علم اگر علمِ نظری ہوتا، تو ان کو حاصل نہ ہوتا۔ (شرح نخبہ:٦)

متواتر سے علم یقینی حاصل ہونے کی دلیل قرآنِ کریم سے:

قرآنِ کریم کا بیان ہے: ﴿**ألم تر كيف فعل ربك بأصحاب الفيل**﴾. (سورۃ الفیل:١)

ترجمہ: کیا تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ۔

(٢) ﴿**ألم تر كيف فعل ربك بعاد**﴾. (سورۃ الفجر:٦)

ترجمہ: تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے عاد کے ساتھ۔

(٣) ﴿**ألم يرو كم أهلكنا من قبلهم من قرن**﴾. (سورۃ الأنعام:٦)

ترجمہ: کیا دیکھتے نہیں کہ کتنی ہلاک کر دیں ہم نے ان سے پہلے امتیں۔

ان آیات میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ مخاطب کو بطریق تواتر معلوم تھے؛ لیکن اس کے باوجود ان کے علم کو رؤیت سے تعبیر کیا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو علم تواتر سے حاصل ہوا، وہ مشاہدہ کے درجہ میں ہے۔ (مقدمہ فتح الملہم ١/١٦)

متواتر اور رواۃ کی حد بندی:

یہ بات گذر چکی ہے کہ متواتر کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کو نقل کرنے والے ایک بڑی تعداد میں ہوں، چنانچہ تعداد کی حد بندی کے بارے میں (جس سے علم یقینی حاصل ہو) اقوال مضطرب ہیں۔

چنانچہ بعض اصولیین نے متواتر کے روات کی تعداد (۱) چار بیان کی ہے، (۲) بعض نے پانچ، (۳) بعض نے دس، (۴) بعض نے بارہ، (۵) بعض نے بیس، (۶) بعض نے چالیس، (۷) بعض نے سترہ، (۸) اور بعض نے اہل بدر کی تعداد کہا (۹) اور بعض نے اہل بیعت رضوان کی تعداد متعین کی ہے وغیرہ، استدلال میں ہر ایک نے اپنے قول کی دلیل میں ایسا واقعہ پیش کیا ہے جس میں اس عددِ خاص کا تذکرہ آیا ہے اور وہ عدد اس واقعہ میں مفیدِ یقین بھی ہوا ہے۔

اور صحیح وہ ہے جو تمام محدثین کا مذہب ہے، وہ یہ ہے کہ تواتر کے لئے تعداد شرط نہیں ہے بلکہ اعتبار حصول علم قطعی کا ہے، چنانچہ اگر اس کو روایت کرنے والے جم غفیر ہوں اور اس سے علم قطعی حاصل نہ ہو، تو وہ متواتر نہیں ہے، اور اگر اس کو روایت کرنے والے کچھ افراد ہیں اور اس سے علم ضروری حاصل ہو جاتا ہے تو وہ یقینی طور پر متواتر ہیں۔

وہ شرطیں جو متواتر کے لئے صحیح نہیں ہیں:

(۱) ابن حجرؒ (م: ۸۵۲ھ) نے ایک شرط کا اضافہ کیا ہے: وہ یہ ہے کہ سامع کو ان کی خبر سے علم قطعی کا فائدہ ہو، سندی (م: ۱۱۸۷ھ) نے شرحِ شرحِ نخبۃ الفکر میں کہا

ہے کہ اس شرط میں ابن حجرؒ متفرد ہیں۔ (شرح شرح نخبۃ ص/۱۸)

(۲) فخر الاسلام (م:۴۸۲ھ) نے ایک اور شرط کا اضافہ کیا ہے، وہ ہے عدالت اور اسلام کا ہونا۔

ابن ملک نے کہا ہے کہ یہ کسی کے نزدیک بھی شرط نہیں ہے؛ کیونکہ اہل بلد اگرچہ کفار ہوں اور اپنے بادشاہ کے قتل کی خبر دیں، تو ان کی خبر سے بھی علم یقینی حاصل ہو جاتا ہے، (۳) بعض نے ایک اور شرط کا اضافہ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ: عدد تواتر میں یہ بات شرط ہوگی کہ رواۃ کی تعداد اتنی ہو کہ ان کا شمار کرنا ممکن نہ ہو، جب کہ دیگر حضرات کی رائے اس کے خلاف ہے اور یہی درست بھی ہے؛ کیونکہ بہت سی مرتبہ کسی ایک مخصوص شہر کے افراد کی خبر سے یا کسی مخصوص واقعہ یا حادثہ سے متعلق کسی علاقہ کے افراد کی خبر سے بھی علم یقینی حاصل ہوتا ہے، باوجود یہ کہ ان حضرات کا شمار ممکن ہوتا ہے، (۴) رواۃ کے انساب وادیان اور بلاد کا اختلاف یہ بھی لازم نہیں ہے، (۵) بعض نے اولیاء اللہ میں سے ہونے کی شرط لگائی ہے، اس کا بھی اعتبار نہیں ہے، کیونکہ فاسق اور اہل بدعت کی خبر سے بھی علم یقینی حاصل ہو جاتا ہے جب کہ دیگر معتبر شرطیں پائی جائیں۔ (۶) اور بعض نے ایک اور شرط کا اضافہ کیا ہے کہ وہ معصوم ہو، یہ بھی فاسد ہے۔ (ظفر الأمانی:۳۷، احکام آمدی:۱/۲۱۵)

اخبار آحاد: تعریف واقسام

خبر الآحاد: آحاد اُحد کی جمع ہے، واحد کے معنیٰ میں، اور خبر واحد وہ ہے جس کو

ایک شخص روایت کرے۔

اصطلاحی تعریف:اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں متواتر کی شرطیں موجود نہ ہوں۔ قطعِ نظراس سے کہ اس کا راوی ایک ہو یا زیادہ، جیسے **عن ابن مسعود رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ : لايمنعن أحدكم أذان بلالا من سحوره فإنه يؤذن ــ أو قال ينادي ــ بليل ليرجع قائمكم وينبه نائمكم وليس الفجر أن يقول هكذا الخ..** (بخاري، كتاب أخبار الآحاد، رقم: ٧٢٤٧)

خبرِ واحد پر عمل کا حکم: اس پر عمل واجب ہے، جب تک کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے مخالف نہ ہو اور اگر مخالف ہو تو واجب نہیں چوں کہ اس کے طریق میں ایک قسم کا شبہ موجود ہے۔

اخبارِ آحاد کی قسمیں

محدثین نے طرقِ احادیث کے جمع کرنے کا اہتمام کیا اور اس کی چھان بین کے بعد اپنے تالیفات میں ایسی روایات کو بھی جگہ دی، جس کا صرف ایک طریق ہو یا وہ حدیث متصل ہو یا معضل ہو، پھر محدثین نے ہر ایک کے اصطلاحی نام مقرر کیے۔ چناں چہ انہوں نے آحاد کو تین قسموں میں منقسم کیا۔ (۱) غریب (۲) عزیز (۳) مشہور۔ (شرح شرح نخبۃ:۲۶، تدریب الراوی:۲/۱۸۰)

غریب: یہ صفت مشبہ ہے جو منفرد کے معنیٰ میں ہے، یا وہ شخص جو اپنے رشتہ دار سے دور ہو۔

جوہری صحاح میں لکھتے ہیں: **والغرابة: الاغتراب، تقول منه تغرب واغترب بمعنیٰ، فهو غريب. واغترب فلان إذا تزوج إلیٰ غير أقاربه، وأغرب الرجل: جاء بشيء غريب.** (الصحاح:۱۹۱)

ترجمہ: غریب غرابت سے بنا ہے، جس کے معنی اغتراب کے ہیں، یعنی سفر کرنے کے ہیں، تم کہتے ہو: فلاں نے سفر کیا، چناں چہ وہ مسافر ہوگیا، اسی طرح "**اغترب فلان**" بولتے ہیں، جب کوئی شخص غیر رشتہ دار میں شادی کرے، نیز "**اغرب الرجل**" کہتے ہیں، جب وہ کوئی انوکھی شئے لائے۔

غریب اصطلاحی: وہ خبر ہے جس کی صرف ایک سند ہو یعنی جس کا راوی صرف ایک ہو خواہ ہر طبقہ میں ہی ایک ہو یا کسی طبقہ میں ایک رہ گیا ہو، جیسے **عن بريدة الأسلمي رضي الله عنه قال: سمع النبي ﷺ رجلا يدعو وهو يقول اللّهم إنی اسألک بأنی أشهد أنک أنت الله لاإله إلا أنت الأحد الصمد الخ..** (ترمذي، ابواب الدعوات، رقم: ۳۴۷۵)

یہ حدیث ٹھیک ہے مگر غریب (بمعنی تفرد اسناد) ہے اور اس کی مالک بن مغول سے اخیر تک یہی ایک سند ہے۔

اقسام غریب: حدیث غریب کی دو قسمیں ہیں: (۱) فرد مطلق (۲) فرد نسبی۔

فرد مطلق: وہ خبر ہے جس کی سند کے شروع میں یعنی طبقۂ تابعین میں غرابت ہو،

بایں طور کہ صرف ایک ہی تابعی اس حدیث کو روایت کرتے ہوں جیسے:"**الولاء لحمة کلحمة النسب، لا یباع ولا یوهب ولایورث**". (ظفر الأمانی ص/۲۵۹) اس حدیث کو حضرت ابن عمرؓ سے صرف عبداللہ بن دینار روایت کرتے ہیں.

فردِ نسبی: وہ ہے جس کی سند کے شروع میں غرابت نہ ہو؛ البتہ وسطِ سند یا آخرِ سند میں غرابت ہو۔ جیسے:"**عن أنسؓ أن رسول اللهﷺ دخل مکة وعلیٰ رأسها المغفر**"، اس روایت میں امام مالکؒ، زہریؒ سے روایت کرنے میں تنہا ہیں۔ (تیسیر مصطلح الحدیث ص/۳۰)

حکم غریب: یہ بھی کبھی صحیح، کبھی حسن اور کبھی ضعیف ہوتی ہے۔

غریب اور فرد میں فرق: لغت کے اعتبار سے تو دونوں لفظ مترادف ہیں، مگر محدثین عام طور پر فرد کا لفظ "فردِ مطلق" کے لئے استعمال کرتے ہیں، جبکہ فردِ نسبی کے لئے لفظ "فرد" بہت کم استعمال کرتے ہیں، اس کے لئے زیادہ تر لفظ "غریب" استعمال کرتے ہیں۔

مواقع احادیث غرائب: مسند بزار، المعجم الأوسط وغیرہ۔

مشہور مصنفات:

(۱)الافراد، امام دارقطنی. (م: ۳۸۵ھ)

(۲)الافراد، ابن شاهین. (م: ۳۸۵ھ)

(۳)غرائب مالک، دارقطنی.(: ۳۸۵ھـ)

(۴)التفرد: السنن التي تفرد بكل سنة منها أهل بلد، امام ابو داودؒ.(م: ۲۷۵ھـ)

(۵)من لم يكن عنده الا حديث واحد، ومن لم يحدث عن شيخه الا بحديث واحد، حافظ ابو محمد الخلال.

(٦)الافراد المخرجة من أصول أبي الحسن، احمد بن عبد الله بن حميد بن رزيق البغدادى نزيل مصر.(الرسالۃ المستطرفہ: ۹۵)

عزیز: جوہری صحاح میں فرماتے ہیں: عز الشيء يعز عزاً وعزةً وعزازة اذا قل، لايكاد يوجد فهو عزيز. (الصحاح:۸۸۵)

اورلسان العرب میں ہے: والعز في الأصل القوة والشدة والغلبة والعز والعزة: الرفعة والامتناع.(لسان العرب:۳۷۴/۵)

عزیز: عز بمعنیٰ قوہ سے بنا ہے جس کے معنیٰ قوت، غلبہ اور شدت کے آتے ہیں، اور عز وعزۃ کے معنیٰ ہیں رفعت وبلندی کے۔

عزیز اصطلاحی: حدیث عزیز کی بھی متعدد تعریفات ہیں، سب سے زیادہ مشہور ومعروف وہ تعریف ہے جو حافظ ابن حجرؒ نے ''شرح نخبہ'' میں کی ہے: وہ فرماتے ہیں: عزیز وہ ہے جس کے راوی دو ہوں خواہ ہر طبقے میں دو ہی دو ہوں یا کسی طبقے میں زائد بھی ہوگئے ہوں؛ مگر کسی طبقے میں دو سے کم نہ ہوں۔ (شرح نخبہ:۱۵، تدریب الراوي:۱۸۱/۲)

مثالِ عزیز: **عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: إنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لایؤمن أحدکم حتیٰ أکون أحب إلیه من والدہ وولدہ ... الحدیث.** (بخاری شریف رقم:۱۴)

ترجمہ: تم میں سے کوئی کامل مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ میں اسے ماں باپ اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

حکم عزیز: خبر عزیز کا حکم یہ ہے کہ وہ کبھی صحیح بھی ہوسکتی ہے کبھی حسن بھی، اور کبھی ضعیف بھی، اس کا مدار سند پر ہوگا۔

اہم مصنفات: کوئی ایسی کتاب جس میں خاص طور سے احادیث عزیز ہی جمع کی گئی ہوں غالبًا ایسی کوئی تالیف موجود نہیں ہے۔

مشہور لغوی: مشہور اسم مفعول ہے اور ''**شہرت الأمر**'' سے ماخوذ ہے۔ جوہری صحاح میں لکھتے ہیں: **والشہرۃ: وضوح الأمر، تقول منه: شہرت الأمر أشہرہ، شہراً، شہرۃً، فاشتہر، أي وضح.** (الصحاح:۷۰۵، القاموس المحیط:۴۲۱)

شہرت کہتے ہیں کسی چیز کا واضح ہونا، جیسے تم کہتے ہو میں نے اس امر کی تشہیر کی، فلاں نے اس کی تشہیر کی تو وہ مشہور ہو گیا، یعنی واضح وظاہر ہو گیا۔

مشہور اصطلاحی: وہ خبر ہے جس کے راوی ہر طبقہ میں دو سے زائد ہوں، مگر تواتر کی تعداد سے کم ہوں یا اس سے علمِ یقینی بدیہی حاصل نہ ہو۔ (شرح نخبۃ:۳۱)

مثال مشہور: **عن عبداللہ بن عمرو عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: ''المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویدہ والمھاجر من ھجر ما نھیٰ اللّٰہ عنه''.**

(بخاری شریف، رقم:۱۰)

ترجمہ: سچا پکا مسلمان وہ ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے تمام مسلمان محفوظ رہیں، اور سچا مہاجر وہ ہے، جو اُن کاموں کو چھوڑ دے، جو اللہ تعالیٰ نے حرام کیے ہیں۔

تنبیہ: عرف عام میں "مشہور" بے اصل بات کو بھی کہتے ہیں، وہ یہاں مراد نہیں ہے۔

مستفیض: بعض لوگوں کے نزدیک حدیثِ مشہور ہی کو مستفیض کہتے ہیں، اور بعض نے اتنی قید اور لگائی ہے کہ ہر طبقہ میں راویوں کی تعداد یکساں ہوں، کسی طبقہ میں کم وبیش نہ ہو، مثلاً سند کے شروع میں راویوں کی تعداد چار ہے، تو آخر تک ہر طبقہ میں تعداد چار رہی ہو، کم وبیش نہ ہوئی ہو۔

نسبت: پہلی رائے کے اعتبار سے مشہور اور مستفیض میں تساوی کی نسبت ہے اور دوسری رائے کے اعتبار سے مشہور عام ہے اور مستفیض خاص۔

سب سے پہلے وہ شخص جنھوں نے احادیثِ مشہورہ بین الناس کی طرف متنبہ کیا، ابنِ قتیبہ (م:۲۷۶ھ) ہیں۔ (تاویل مختلف الحدیث:۷۳-۷۶)

اہم مصنفات:

علماء نے احادیث مشہورہ بین الناس کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح ہے یا ضعیف یا موضوع وغیرہ۔

(۱) التذکرة في الأحادیث المشتهرة: علامہ زرکشیؒ. (م: ۷۹۴ھ)

(۲)اللآلي المنثورة في الأحاديث المشهورة: حافظ ابن حجرؒ.(م: ۸۵۲ھ)

(۳)المقاصد الحسنة في بيان كثير من الأحاديث المشتهرة علىٰ الألسنة: حافظ سخاویؒ.(م: ۹۰۲ھ)

(۴)الدرر المنتشرة في الأحاديث المشتهرة: حافظ سیوطیؒ.(م: ۹۱۱ھ) (تخریج الحدیث نشأتہ ومنہجیتہ:۷۸)

(۵)الوسائل السنية من المقاصد السخاوية والجامع والزوائد الأسيوطية: أبوالحسن على بن محمد بن محمد بن خلف المنوفي.

(٦)الدرة اللامعة في بيان كثيرمن الأحاديث الشائعة: احمد بن محمد بن عبدالسلام المنوخی. (الرسالۃ المستطرفۃ:١٥٦)

(۷)كشف الخفاء ومزيل الألباس عمّا اشتهر من الأحاديث علىٰ ألسنة الناس: امام عجلونی.(م: ۱۱٦۲ھ)

اخبارآحاد کی قسمیں باعتبار روات

راویوں کے حالات کے اعتبار سے آحاد کی دوقسمیں ہیں :(۱)مقبول (۲) مردود (یعنی ناقابلِ عمل)۔

مقبول:وہ خبر ہے جس کے مخبر کا صدق غالب ہو،جیسے عن معاذ بن جبل رضي الله عنه قال: سمع النبي ﷺ رجلا يدعو وهو يقول أللّهم إني

أسألک تمام النعمة الخ.. (ترمذي: أبواب الدعوات، رقم: ۳۵۵۰) یہ حدیث صحیح ہے اس لئے کہ اس میں تمام شرائط قبولیت موجود ہے۔

حکم مقبول: اس سے احتجاج کیا جائے گا اور اس پر عمل واجب ہے۔

مردود: وہ خبر ہے کہ جس کے مخبر کا صدق غلب نہ ہو، اب چاہے کذب غالب ہو یا دونوں برابر ہو، جیسے **محمد بن شجاع البلخي عن حسان بن هلال عن حماد بن سلمه عن أبی المهزم عن أبی هريرة مرفوعا، إن الله خلق الفرس فأجراها فعرقت فخلق نفسه منها.**

محمد بن شجاع نامی راوی بد دین تھا، اور حدیث وضع کرتا تھا، ابوالمہز م کے متعلق امام شعبہ کا قول ہے کہ اگر اس کو ایک درہم دوگے تو پچاس حدیثیں گھڑھ دیگا۔ (تدریب الراوی: ۱/۲۳۵)

حکم مردود: اس سے احتجاج نہیں کیا جائے گا اور اس پر عمل واجب نہیں۔

تنبیہ: کوئی حدیث شریف فی نفسہ مردود (غیر مقبول) نہیں ہوسکتی، صرف راوی کے غیر معتبر ہونے کی وجہ سے مردود کہلاتی ہے۔

اخبارِ آحاد ہی مقبول و مردود کیوں ہیں، متواتر کیوں نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: اخبار آحاد سے استدلال موقوف ہے ان کے روات کی چھان بین پر اور راوی معتبر ہوتے ہیں اور غیر معتبر بھی، اس لئے آحاد کی دو قسمیں ہوگئی۔

اب رہا سوال کہ خبر واحد سے استدلال رواۃ کی تحقیق پر کیوں موقوف ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنے مخبر کے قطعی صدق کا فائدہ نہیں دیتی، برعکس متواتر کے، کہ وہ اپنے مخبر کے صدق کا قطعی طور پر فائدہ دیتی ہے اس لئے اس کے رواۃ سے بحث نہیں کی جاتی؛ بلکہ جو خبر بھی حد تواتر کو پہنچ جاتی ہے، اس سے استدلال درست ہوتا ہے؛ لہٰذا تمام متواتر مقبول ہی ہوں گی۔

اب سوال یہ ہے کہ صرف مقبول پر عمل کرنا کیوں واجب ہے، جب کہ مردود اصطلاحی کی ایک صورت وہ بھی ہے جس میں صفت رد نہیں پائی جاتی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ صفت جو وجوب عمل کا تقاضہ کرتی ہے، وہ صرف مقبول اصطلاحی میں پائی جاتی ہے، اور وہ صفت صرف مقبول اصطلاحی میں اس لئے پائی جاتی ہے کہ خبر آحاد دو حال سے خالی نہیں یا تو اس میں صفت قبول کی دلیل یعنی راوی کے سچے ہونے کا ثبوت پایا جائے گا یا نہیں، اگر پہلی صورت ہے تو غالب گمان یہ ہے کہ وہ سچی ہے، کیونکہ اس کا راوی سچا ہے، لہٰذا اس پر عمل کیا جائے گا، اور اگر دوسری صورت ہے تو بھی دو حال سے خالی نہیں یا تو اس میں صفت رد کی دلیل یعنی راوی کے جھوٹے ہونے کا ثبوت پایا جائے گا یا نہیں، اگر پہلی صورت ہے تو غالب گمان یہ ہے کہ وہ خبر جھوٹی ہے کیونکہ اس کا راوی جھوٹا ہے، لہٰذا اس پر عمل نہیں کیا جائے گا، اور اگر دوسری صورت ہے تو بھی وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو اس میں قبول یا رد کا قرینہ ہوگا یا نہیں، اگر ہے تو دونوں قسموں میں سے ایک کے ساتھ لاحق کر دینگے اور اگر کوئی قرینہ نہیں تو اس پر توقف کیا جائے گا یہ مثل مردود کے ہے، اس سے

پتہ چلا کہ خبرآحاد کی پانچ صورتیں ہیں، (۱) وہ خبر جس میں صفت قبول کی دلیل موجود ہو، (۲) وہ خبر جس میں صفت قبول کا قرینہ موجود ہو، (۳) وہ خبر جس میں صفت رد کی دلیل موجود ہو، (۴) وہ خبر جس میں صفت رد کا قرینہ موجود ہو، (۵) وہ خبر جس میں نہ کوئی دلیل نہ کوئی قرینہ ہو، ان پانچ میں سے پہلی دونوں صورتوں کو مقبول کہا جاتا ہے اور ان پر عمل کرنا واجب ہے۔

واللہ اعلم. (شرح الشرح ۲۱۱،۲۱۳ نزہۃ النظر ص/۸۲،۸۳)

دوسرا باب

قبولیتِ خبر واحد کی شرطیں

قبولیت خبر واحد کی شرطیں

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہر خبر مقبول نہیں ہوسکتی، وہی خبر مقبول ہوگی جس میں قبولیت کی تمام شرطیں موجود ہوں، خواہ وہ سند سے متعلق شرط ہو یا متن سے متعلق۔ خود صحابہ وتابعین بھی اخذ علم کے سلسلہ میں تحری سے کام لیا کرتے تھے، وہ ہر کس وناکس سے علم حاصل نہیں کرتے تھے، چنانچہ امام مسلمؒ نے ایسے بہت سے آثار کا ذکر کیا ہے، جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علماء نے روایت کے سلسلہ میں حد درجہ تثبت سے کام لیا اور وہ ان ہی سے اخذ حدیث کرتے تھے، جو اس سلسلے میں معروف ومشہور ہوں اور اس کے اہل ہوں، ابن سیرین فرماتے ہیں: کہ علم ایک دین ہے، تم اپنے دین کو جن سے حاصل کرتے ہو، ان کو دیکھ لو۔

اسی طرح سعد بن ابراہیم سے بھی منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ آقا ﷺ سے حدیث صرف ثقات ہی بیان کریں۔ (مسلم شریف: ۱/۸۴-۸۷)

اسی طرح ابن عمرؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم صرف ثقہ سے ہی اخذ علم کریں۔

نیز امام بیہقیؒ (م: ۴۵۸ھ) نے بھی حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً وموقوفاً روایت کیا ہے کہ تم انہیں سے اخذ علم کرو جن کی شہادت کو تم قبول کرتے ہو۔ (تدریب الراوی: ۱/۳۰۰-۳۰۱)

قبولیتِ خبر کے لیے محدثین نے چند شرطوں کا ذکر کیا ہے جس روایت میں یہ

شرطیں پائی جائیں گی وہ روایت قابلِ اعتماد ہوگی۔

پہلی شرط:

عدالت: عدالت یہ ایک ایسا ملکہ ہے جو انسان کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ تقویٰ اور مروّت کے دامن کو لازم پکڑے۔

عدالت کا تحقق چند چیزوں کے پائے جانے سے ہوتا ہے۔

(۱) مسلمان ہونا: یہ شرط ادا ہے نہ کہ شرط تحمل، اس لئے کہ بہت سے صحابہ نے اسلام لانے سے پہلے تحمل حدیث کیا اور اسلام لانے کے بعد اس کو ادا کیا؛ چنانچہ جس نے کفر کی حالت میں حدیث سنی اور کفر کی حالت ہی میں بیان کی، تو اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، اس لئے کہ کفر فسق سے بھی بڑھ کر ہے۔

(۲) بالغ ہونا: یہ شرط ادا ہے نہ کہ شرطِ تحمل، چنانچہ بہت سے صغار صحابہ نے صغر سنی میں ہی تحمل حدیث کیا اور بلوغت کی دہلیز پر پہنچنے کے بعد ادا کیا۔ اس شرط کا مقتضا یہ ہے کہ جنہوں نے بچپن میں حدیث سنی اور بچپنہ کی حالت میں ہی بیان کی تو اس کی بھی روایت قبول نہیں کی جائے گی۔

(۳) عاقل ہونا: اس لئے کہ مجنون کی عقل میں خلل واقع ہو، جس کی وجہ سے وہ روایت میں مأمون نہیں ہوگا، چاہے وہ جنون جنونِ مطبق ہو یا غیر مطبق۔

(۵) اسبابِ فسق سے پاک ہونا: چناں چہ کبائر کا مرتکب نہ ہو اور صغائر پر مصر نہ ہو اور مبتدع نہ ہو۔

(۵) مروت کے خلاف امور سے پاک ہونا: یعنی ایسے امور سے بچنا جو مروت کو مخدوش کردے۔

محدثین کے نزدیک راوی کی عدالت دو امر میں سے کسی ایک کے ذریعہ پہچانی جاتی ہے۔(۱) استفاضہ اور شہرت (۲) علماء جرح وتعدیل راوی کی عدالت کی صراحت کردیں۔

دوسری شرط:

ضابط ہونا:

ضبط کی دو قسمیں ہیں: (۱) ضبط صدر (۲) ضبط کتاب

ضبط صدر: یہ ہے کہ سماعِ حدیث سے ادا تک خوب اچھی طرح یاد رکھنا کہ جب چاہے بلا تکلف بیان کرسکے اور کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

ضبط کتاب: خوب اچھی طرح لکھ کر رکھنا، لکھے ہوئے کی تصحیح کر لینا، اور مشتبہ کلمات پر اعراب لگالینا۔

راوی کے ضبط کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی روایت کا ان ثقہ راویوں کی روایت سے موازنہ کیا جائے، جو ضبط واتقان میں معروف ومشہور ہیں، اگر اس کی روایت ان کی روایت کے موافق ہو (چاہے اکثر ہی موافق ہو اور روایت بالمعنیٰ ہی کیوں نہ ہو) تو وہ ضابط ہے، اور اگر مخالفت زیادہ ہے، تو پھر یوں سمجھا جائے گا کہ اس کے ضبط میں خلل ہے؛ لہذا اس کی حدیث سے احتجاج نہیں کیا جائے گا، ہاں اگر راوی کے پاس

کوئی اصل کتاب صحیح موجود ہے اور اس نے اپنے حفظ پر اعتماد کئے بغیر ادا کا التزام کیا ہے تو اس کی روایت قبول کی جائے گی۔

مجہول الحال: وہ مقل حدیث راوی ہے، جس سے نام لے کر ایک سے زائد راویوں نے روایت کی ہو، مگر کسی امام نے اس کی توثیق نہ کی ہو، چناں چہ اس کی خبر قبول کرنے میں اختلاف ہے، مشہور یہ ہے کہ اس وقت تک توقف کیا جائے، جب تک کہ حال کی صحیح خبر نہ ہو جائے۔

رواۃ کی اہلیت کو پہچاننے کے طریقے:

قبول خبر کے لئے راوی کا اہل ہونا شرط ہے اور اس کا تعلق جرح وتعدیل سے ہے، بہت سے وہ ائمہ جن کی عدالت وفضیلت اور علم لوگوں کے درمیان معروف ومشہور ہے، ان کی چھان بین کی ضرورت نہیں ہے، جیسے امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ۔

لیکن وہ ائمہ جو عدالت وفضیلت اور علم میں مشہور نہیں ہیں، ان کے بارے میں ائمہ کے اقوال دیکھے جائیں گے۔ اگر ایک ہی شخص کے بارے میں ایک ہی وقت میں جرح مفسّر اور تعدیل دونوں جمع ہو جائیں، تو اس کی دو صورتیں ہیں:

(ا) ان دونوں چیزوں کا صدور ایک ہی امام کی جانب سے ہوا ہوگا، یا دو امام کی جانب سے، اگر ایک ہی امام کی جانب سے ہوا ہو، تو اس کی بھی دو حالتیں ہیں:

(ا) امام کے اجتہاد کا تغیر اس راوی کے بارے میں ظاہر ہوا ہوگا یا نہیں، اگر ظاہر

ہو گیا ہے، تو دو قولوں میں سے آخری قول پر عمل کیا جائے گا۔ (۲) اور اگر تغیر کا ظہور نہیں ہوا ہے، تو عمل مندرجۂ ذیل کے مطابق ہوگا:

(۱) جہاں تک ہو سکے، دونوں قول کے درمیان جمع و تطبیق سے کام لیا جائے گا۔ (۲) اگر تطبیق ممکن نہ ہو، تو قرائن کے ذریعہ کسی ایک کو راجح قرار دیا جائے گا۔ (۳) اگر قرائن موجود نہ ہوں، تو اہل نقد کے اقوال سے جو قول سب سے زیادہ قریب ہو اور ائمۂ معتدلین کے اقوال میں جو سب سے زیادہ خاص ہو، اس کو لیا جائے گا۔ (۴) اور جب یہ تمام چیزیں ممکن نہ ہوں تو جب تک کوئی ترجیحی سبب نہ پایا جائے، توقف سے کام لیا جائے گا۔

(۲) اگر جرح مفسر اور تعدیل کا صدور دو الگ الگ اماموں کی جانب سے ہوا ہے تو اس سلسلے میں تین مذاہب ہیں:

(۱) جمہور کا قول یہ ہے کہ جرح مفسر کو تعدیل پر مطلقاً مقدم رکھا جائے گا، (۲) بعض کا قول ہے کہ تعدیل کو جرح پر مقدم کیا جائے گا، (۳) اور بلقینی کا قول ہے کہ احفظ کے قول کو مقدم کیا جائے گا۔

راجح یہ ہے کہ اصل جرح مفسر کو تعدیل پر مقدم کیا جائے اور تعدیل کو جرح مبہم پر؛ لیکن یہ اصل بھی علی الاطلاق نہیں ہے، بلکہ چند قواعد کے ساتھ مقید ہے، جن میں سب سے زیادہ اہم یہ ہیں:

(۱) جب توثیق متشددین مثلاً شعبہ، یحییٰ بن سعید القطان، امام نسائی کی جانب

سے ہو، تو اس کو فوراً قبول کر لیا جائے گا۔(۲) جب توثیق متساہلین مثلا امام ترمذی، امام حاکم، ابن حبان وغیرہ کی جانب سے ہو، اور بعد والے ائمہ میں سے کوئی ان کے موافق ہو، تو قبول کیا جائے، او راگر وہ اس میں منفرد ہے، تو قبول نہیں کیا جائے گا۔(۳) معتدلین مثلا سفیان ثوری، امام احمد بن حنبل، امام بخاریؒ وغیرہ کے اقوال پر جرح وتعدیل کے بارے میں اعتبار کیا جائے گا، جب تک کہ ان کی توثیق جرح مفسر کے معارض نہ ہو۔(۴) جرح کے قبول کرنے میں توقف سے کام لیا جائے، جبکہ اس کے قبول کرنے سے اختلاف فی المذہب یا آپسی لڑائی جھگڑے کا اندیشہ ہو۔(تخریج الحدیث نشأتہ ومنہجیتہ:۲۱۴)

وہ شرطیں جو متن میں معتبر ہیں

یہ بات گذر چکی ہے کہ عادل کی خبر قبول کی جائے گی، اس کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ علماء نے متن کے سلسلہ میں بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے، اور اسی باریک بینی کے نتیجہ میں انہوں نے چند ایسی نشانیاں اخذ کیں کہ راویوں کے عادل اور ثقہ ہونے کے باوجود وہ نشانیاں روایت کے عدمِ قبول کا سبب بن جاتی ہیں، کیونکہ رواۃ حفظ واتقان کے کتنے ہی اونچے مقام پر کیوں نہ پہنچ جائیں، وہ معصوم عن الخطأ نہیں ہیں اور وہ علماء جو مشتغلین بالحدیث ہیں، ان کو ایسا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ آقا ﷺ کے کلام کو غیر کے کلام سے بآسانی ممتاز کر لیتے ہیں، چنانچہ علماء نے چند ایسے قواعد وضع کئے ہیں جن میں سے اکثر کا تعلق متن سے ہے۔

مثلاً متن میں رکاکتِ لفظ ہو یا وہ حس یا مشاہدہ کے خلاف ہو یا قواعد شرعیہ کے خلاف ہو یا احادیثِ مشہورہ صحیحہ کے خلاف ہو وغیرہ۔

چناں چہ محدثین نے سند و متن کے مابین الفاظ لاکر واضح کر دیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا اسناد صحیح ہے، چناں چہ وہ کہتے ہیں: ''**إسناده صحيح يا حديث صحيح**''۔ کبھی سند صحیح ہوتی ہے اس کے باوجود کسی علت کی بناء پر متن میں ضعف پایا جاتا ہے۔

حدیثِ معلل: وہ حدیث ہے جسمیں راوی نے وہم کی وجہ سے کوئی تغیر وتبدل کر دیا ہو اور اس وہمی تغیر کا علم قرائن کی وجہ سے اور تمام سندیں اکٹھا کرنے کی وجہ سے ہوا ہو۔

علت کو پہچان نے کا طریقہ یہ ہے کہ روایت احفظ کے خلاف ہو، جو اس بات پر دال ہوگی کہ اس سے وہم ہوا ہے، مثلا مرسل کو متصل، موقوف کو مرفوع وغیرہ بیان کرنا ان چیزوں کا علم تعدد طرق اور روات کی چھان بین کرنے سے ہوتا ہے۔ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم: ۱۲۲)

وہم کی شناخت: صرف وہی شخص کرسکتا ہے، جس کو ذہنِ ثاقب، حفظِ کامل اور معرفتِ تامہ عطا ہوئی ہو اور وہ روات کے مراتب کو جانتا ہو۔

شاذ: وہ حدیث ہے، جس کا راوی ثقہ ہو، مگر اس کی روایت کسی راوی اوثق کی روایت کے خلاف ہو، جب کہ بعض محدثین ایسے راوی کی روایت کو بھی شاذ کہتے ہیں جس کو سوءِ حفظ لازم ہو۔

مثال شاذ: وہ روایت ہے جس کو ابوداؤد، ترمذی نے عن عبدالواحد ابن زیاد عن الأعمش عن ابی صالح عن ابی ہریرةؓ مرفوعاً روایت کیا ہے ''**اذا صلیٰ أحدکم الفجر فلیضطجع عن یمینه**'' بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اکثر محدثین نے اس میں عبدالواحد کی مخالفت کی ہے کیونکہ محدثین نے نقل کیا ہے کہ یہ آپ ﷺ کا فعل ہے نہ کہ قول، جب کہ عبدالواحد تنہا اس کو حدیثِ قولی کے طور پر نقل کرتے ہیں۔ (تیسیر مصطلح الحدیث:۱۱۸)

مروی سے متعلق شرائط:

امام ابوحنیفہ خبر واحد کی قبولیت کے لئے مندرجۂ ذیل شرائط عائد کرتے ہیں:

(۱) خبر واحد اس صورت میں مقبول ہوگی، جب کہ وہ سنت مشہورہ (خواہ قولی ہو یا فعلی) کے خلاف نہ ہو، اس لئے کہ دو دلیلوں میں سے اس دلیل پر عمل کیا جاتا ہے جو قوی تر ہو۔ خبرِ واحد کا سنتِ مشہورہ کے خلاف ہونا علامت ہے کہ یہ قوی نہیں ہے۔

(۲) خبر واحد اس عمل متواتر کے خلاف نہ ہو، جو صحابہ اور تابعین میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے، خواہ وہ کسی شہر میں سکونت پذیر ہوں، اس میں کسی شہر کی کوئی تخصیص نہیں۔

(۳) خبر واحد اس صورت میں مقبول ہے، جب کہ کتاب اللہ کے عمومات وظواہر کے خلاف نہ ہو، اس لئے کہ کتاب اللہ کے ظواہر وعمومات قطعی الدلالت ہیں اور قطعی، ظنی پر مقدم ہوتا ہے، ہاں خبر واحد کتاب اللہ کے ظاہر یا عموم کے خلاف نہ ہو، بلکہ قرآن کی شرح وتفسیر پر مشتمل ہو، تو امام ابوحنیفہ اس پر عمل کرتے ہیں، اس لئے کہ شرح وتفسیر کے بغیر آیت قرآنی کسی بات پر دلالت نہیں کرسکتی۔

(۴) خبر واحد قیاس جلی کے خلاف ہو، تو مقبول ہوگی، جبکہ اس کا راوی فقیہ ہو، راوی کے غیر فقیہ ہونے کی صورت میں اس بات کا احتمال ہے کہ راوی نے روایت بالمعنیٰ کی ہو اور اس سے اس میں غلطی سرزد ہوگئی ہو۔

(۵) خبر واحد کا تعلق ایسے امور کے ساتھ نہ ہو، جو عام لوگوں کو پیش آتے ہیں مثلاً حدود و کفارات جو ادنیٰ شبہ کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں۔

(۶) عہد سلف میں کسی عالم نے اس حدیث پر جرح وقدح نہ کی ہو، نیز یہ کہ حدیث کے راوی نے کسی دوسرے صحابی کے اختلاف کی وجہ سے اس پر عمل کو ترک نہ کیا ہو۔

(۷) قبولیت خبر واحد کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ راوی کا عمل اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف نہ ہو، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب کتاّ کسی برتن میں منھ ڈال دے تو اس کو سات مرتبہ دھویا جائے، مگر وہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے تھے، اس وجہ سے امام صاحب نے ان کی روایت پر عمل ترک کر دیا۔

(۸) خبر واحد اس صورت میں مقبول ہے، جب کہ اس کا راوی دیگر ثقہ راویوں کے خلاف اس حدیث کی سند یا متن میں کوئی اضافہ نہ کر رہا ہو، اگر وہ اضافہ کرے گا تو احتیاط کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ثقات کی روایت پر عمل کیا جائے گا۔

بعض حضرات امام صاحبؒ کے اخذ کردہ اصولوں سے ناواقف تھے، لہٰذا انہوں نے امام صاحب پر طرح طرح کے اعتراضات کیے ہیں؛ لیکن اعتراض کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ ناواقفیت کی بناء پر صادر ہوتے ہیں۔ (تانیب الخطیب: ۳۰۰)

تیسرا باب

اخبار آحاد احکام وعقائد میں مطلقا حجت ہیں
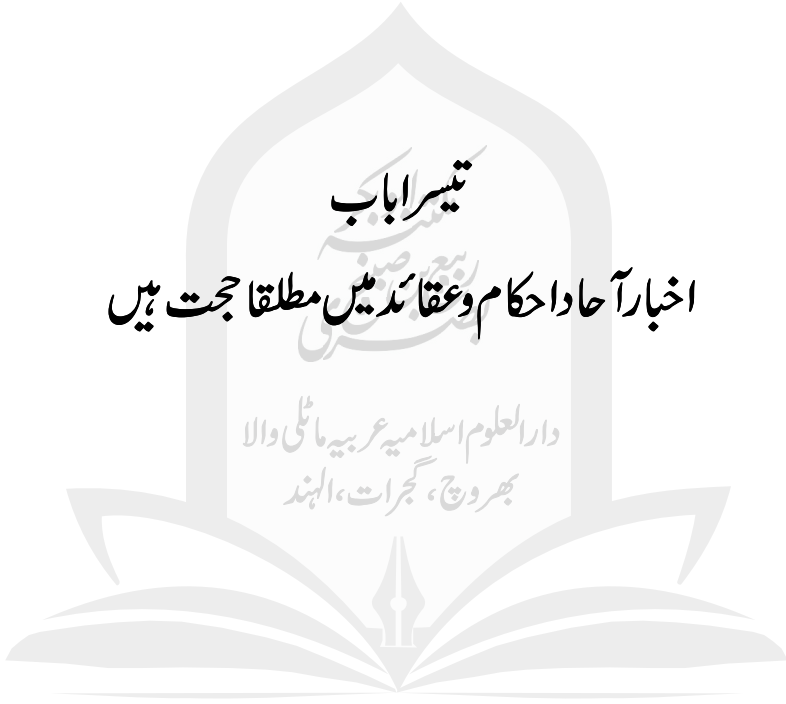
اخبارِ آحاد احکام وعقائد میں مطلقا حجت ہیں

جمہور علماءِ سلف وخلف، صحابہ، تابعین، اصحاب حدیث وفقہ واصول کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خبرِ واحد احکام وعقائد دونوں میں حجت ہے۔

ابن بطال (م: ۴۴۹ھ) فرماتے ہیں کہ: اخبارِ آحاد کے موجب عمل ہونے پر سب کا اجماع ہے۔ (فتح الباری: ۱۳/ ۳۲۱)

امام ابو محمد بن حزم (م: ۴۵۶ھ) فرماتے ہیں کہ ابو سلیمان حسین بن علی الکرابسی، حارث بن اسد محاسبی وغیرہ کا کہنا ہے کہ ثقہ کی خبرِ واحد اپنے مثل کے موجب علم وعمل ہے۔ (الاحکام: ۱/ ۹۸-۱۰۲)

خطیب بغدادی (م: ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں کہ: تمام تابعین وفقہاء کا خبرِ واحد کے موجبِ عمل ہونے پر اجماع ہے، کسی سے نکیر منقول نہیں ہے، اگر کوئی اس کا قائل نہ ہوتا، تو ہمیں یہ بات معلوم ہوتی۔ (الکفایۃ: ۷۲)

ابن عبد اللہ فرماتے ہیں: (م: ۴۶۳ھ) کہ تمام اہلِ علم کا عادل کی خبرِ واحد کو اعتقادات میں روایت کرنے کا معمول چلا آرہا ہے اور اس کو شرعاً وحکماً ودیناً اپنے اعتقادات میں حجت قرار دیتے ہیں، یہی جماعت اہل سنت کا نظریہ ہے۔ (التمہید: ۱/ ۲)

نیز فرماتے ہیں کہ ثقات، اثبات کی اخبار آحاد جو متصل الاسناد ہیں، تمام علماء امت کے نزدیک موجب عمل ہے۔ (جامع بیان العلم وفضلہ: ۲۷۵)

ابن دحیہ فرماتے ہیں: (م: ۶۳۳ھ) خبرِ واحد کے قبول کرنے پر تمام صحابہ،

تابعین، فقہاء مسلمین اور اہل سنت والجماعت کا اتفاق رہا ہے، سب کے سب خبر واحد پر ایمان لاتے ہیں اور اعتقاد میں اس کو حجت تسلیم کرتے ہیں۔ (الابتہاج فی احادیث المنہاج:۸۷) اور اسی کو حافظ ابن الصلاح (م:۶۴۳ھ) نے راجح قرار دیا ہے۔ (مقدمہ علوم الحدیث:۲۴)

ابن کثیر (م:۷۷۴ھ) فرماتے ہیں: میں ابن الصلاح کے ساتھ ہوں، نیز انہوں نے ابن تیمیہ (م:۷۲۸ھ) کے فتاویٰ سے اس مضمون کو نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حدیث کے قطعی ہونے کی قائل ایک جم غفیر ہے، ان ہی میں سے قاضی عبد الوہاب مالکیؒ، (م:۴۲۲ھ) شیخ ابو احمد اسفرائنیؒ (م:۴۰۶ھ)، قاضی ابو الطیب طبری (م:۴۵۰ھ)، شیخ ابو اسحاق الشیر ازی (م:۴۷۶ھ)، شافعیہ میں سے، ابن حامد ابویعلیٰ بن فراء (م:۴۵۹ھ)، ابوالخطاب (م:۵۱۰ھ)، ابن زعفرانی اور ان کے مثل حنابلہ میں سے، اور حنفیہ میں سے شمس الائمہ (م:۴۵۰ھ) وغیرہ ہیں، نیز ائمۂ اربعہ بھی اس مسئلے میں متفق ہیں۔ (الباعث:۱/۱۲۷)

ابن قیم فرماتے ہیں: (م:۷۵۱ھ) کہ اہل سنت والجماعت کا مشہور استدلال یہ ہے کہ متقدمین ومتأخرین اہل اسلام کا اس پر بات پر اجماع رہا ہے کہ وہ ان تمام احادیث کو، جس کا تعلق صفات اللہ تعالیٰ سے ہو، یا مسائل قدر، رؤیت، اصول ایمان اور شفاعت وغیرہ سے ہو، روایت کرتے چلے آئے ہیں، اور یہ تمام چیزیں عملی ہیں نہ کہ صرف علمی اور اس کو روایت کرنے سے مقصود صرف یہی ہے کہ سامع کو علم حاصل ہو جائے، اگر ہم اخبارِ آحاد کو عقائد میں معتبر نہ مانیں اور علم کو واجب قرار نہ دیں، تو گویا ہم نے علماء امت کے

عمل کو ان اخبار کے نقل میں خطاء پر محمول کیا اور ہم نے ان کو ایسی چیزوں کے ساتھ مشغول پایا جو کسی کو نہ فائدہ پہچائے اور نہ خود کو نفع دیں، اور یہ ایسا ہی ہو گیا کہ انہوں نے امور دین میں ایسی چیزیں مدون کیں کہ جن پر اعتماد جائز نہیں ہے۔ (مختصر الصواعق المرسلۃ:۱/۶۰۸)

علامہ عبد الحی لکھنویؒ (م:۱۳۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ: اس کا حکم یہ ہے کہ وہ موجبِ عمل ہے، جب تک کتاب وسنت کے مخالف نہ ہو اور یہی جمہور کے نزدیک صحیح اور پسندیدہ ہے۔ (ظفر الامانی:۶۱)

احمد محمد شاکر فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے جس کے قائل ابن حزم بھی ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں کہ حدیث مفید علم قطعی ہے، چاہے صحیحین میں ہو یا ان کے علاوہ میں، اور علم یقینی علمِ نظری بدیہی ہے اور یہ علوم متبحر في العلوم کے سامنے ہے منکشف ہوتے ہیں، لیکن چند متکلمین جو علم وظن کے مابین فرق کر کے کچھ اور معنیٰ مراد لیتے ہیں۔ (الباعث:۱/۱۲۵)

ان کے دلائل جو خبرِ آحاد کو احکام وعقائد میں مطلقا حجت مانتے ہیں:

جو حضرات عقائد میں اخبارِ آحاد کو معتبر مانتے ہیں انہوں نے قرآن وسنت اور اجماع وقیاس سے استدلال کیا ہے۔

چنانچہ آیات قرآنیہ صراحۃً یا ضمناً اس بات پر دال ہیں کہ جو باتیں آقا سے ﷺ سے ہمیں پہنچیں، ہم ان کو اخذ کریں۔

طریق تواتر یا طریق آحاد کی تفریق کئے بغیر سلف امت وتابعین نے تمام

چیزیں جوآقاﷺ سے بطورصحت منقول ہیں،اللہ تعالیٰ کےقول:﴿وما آتاكم الرسول فخذوه و مانهٰكم عنه فانتهوا﴾.(الحشر:۷)پرعمل کرتے ہوئےقبول کیا۔

لیکن جب فتنےنمودار ہونے لگےاور الگ الگ جماعتیں قائم ہونےلگیں، ہرایک نے اپنے لئے کچھ اصول مقررکر لئے،جن کووہ اپنی عقلوں پر جانچتے تھے،جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض حضرات آقاﷺ کی احادیث کوآپسی معارض بتانے لگےاورمخرج کے بارے میں بحث ومباحثہ کرنے لگےاوروہ لوگ اخبار کوقطعی الثبوت وظنی الثبوت اور قطعی الدلالت وظنی الدلالت متواتر وآحاد میں تقسیم کرنے لگے ،اور چونکہ اکثر احادیث آحاد ہیں،توانھوں نے اپنی ساری توجہ اسی پرمرکوز کردی اور کہنے لگے کہ یہ آحاد ظنی الثبوت ہیں اوروہ لوگ اموراعتقادیہ اورامورعملیہ میں فرق کرنے لگےاور وہ احادیث آحاد سے احکام میں استدلال کرنے لگےاورعقائد میں استدلال کوچھوڑ دیا بلکہ بعض نے تو اتنا غلوکردیا کہ متواتر تک کا انکارکردیا،انہیں کےطریق پر چلتے ہوئے بعضوں نے مطلقاً سنت کا انکارکردیا اور یہ وہ لوگ ہیں جواس زمانہ میں اہل قرآن واہل حدیث سےمعروف ہوئے۔ لاحول ولاقوۃالاباللہ.

دلیل اول قرآن کریم

(۱)ارشادِخداوندی ہے:﴿فلولا نفرمن كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلّهم يحذرون﴾. (التوبہ:۱۲۲)

ترجمہ:سوکیوں نہ نکلا ہرفرقہ میں ان کاایک حصہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں اور تاکہ خبر پہچائیں اپنی قوم کوجب کہ لوٹ کرآئیں ان کی طرف تاکہ وہ بچتے ہیں۔(ترجمۂ شیخ الہند)

اس آیت کریمہ میں (لیتفقھوا)(لینذروا)اور(رجعوا) کی ضمیر کا مرجع طائفۃ ہے،اور(الیھم)اور(لعلّھم) کی ضمیر کا مرجع فرقۃ ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اطراف عالم میں پھیلے ہوئے علماء کے پاس جاکر دین کے بارے میں تفقہ حاصل کریں اور واپس آکر حضرات (فرقہ) کو جو معاش یااہل وعیال اور مال کی محافظت کی وجہ سے علماء کے پاس نہیں جاسکےاوروہ اپنے گھروں پر ہی انھیں ڈرائے یہ اس طائفہ کی ذمہ داری ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ڈرانے کاعمل طائفہ پرواجب کیااورقبول کرنے کاعمل فرقۃ پر، کیونکہ ''انذار'' کی انتہاء ''قبول'' ہے،اورفرقۃ کا اطلاق تین یااس سے زیادہ پر ہوتا ہے، جبکہ طائفۃ کا اطلاق دو یاایک پر، چنانچہ اس سے معلوم ہوا کہ دواور ایک کی خبر موجب عمل ہے۔(ظفرالأمانی :٦٢)

امام سرخسی (م:۴۵۰ھ): فرماتے ہیں: طائفہ صرف جماعت کا نام نہیں ہے، اس لیے کہ متقدمین طائفہ کی تفسیر کے بارے میں مختلف ہیں، چناں چہ محمد بن کعب(م:۱۰۸ھ)فرماتے ہیں: طائفہ کا اطلاق صرف ایک پر ہوتا ہے،عطاء(م:۱۱۴ھ)فرماتے ہیں: دو پر ہوتا ہے، زہری(م:۱۲۴ھ)فرماتے ہیں: تین پر ہوتا ہے، حسن(م:۱۱۰ھ) فرماتے ہیں: دس پر ہوتا ہے کوئی بھی دس سے زیادہ کا قائل نہیں ہے۔ (اصول السرخسی: ۱/۳۲۳)

ابن اثیر(م:۵۴۴ھ) فرماتے ہیں: طائفہ کا اطلاق ایک پر بھی ہوتا ہے۔

(النہایہ:۳/۱۵۳)

وجہِ ثانی: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طائفہ کو انذار کا حکم دیا ہے (اور طائفہ کا اطلاق ایک اور اس سے بھی زیادہ پر ہوتا ہے) اور امر وجوب کا تقاضہ کرتا ہے، اگر ایک یا اس سے زیادہ آدمیوں کے انذار سے کوئی فائدہ نہ ہوتا، تو اللہ تعالیٰ انذار کو واجب نہ کرتے۔

(اصول السرخسی:۱/۳۲۳)

چناں چہ امام بخاریؒ نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: **باب ما جاء في إجازة خبر الواحد الصدوق، وقول الله تعالیٰ: ﴿فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة﴾**. اور باب میں تقریباً بائیس احادیث کو ذکر فرمایا ہے، جو اس بات پر دال ہے کہ خبرِ واحد موجبِ عمل ہے۔

چناں چہ حافظ ابن حجرؒ (م:۸۵۲ھ) اس ترجمہ کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہاں اجازت سے مراد خبرِ واحد پر عمل کا جواز ہے، نیز اس بات پر دال ہے کہ خبرِ واحد حجت ہے، اور ترجمہ سے مقصود ان لوگوں پر رد ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ خبرِ واحد اسی وقت حجت ہے، جب کہ اس کو روایت کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں، یہاں تک کہ وہ شہادت کے مانند ہو جائے۔ (فتح الباری:۱۳/۲۳۳)

ابو محمد بن حزم (م:۴۵۶ھ) فرماتے ہیں: دین وشریعت کی تبلیغ کرنے والا عادل ہوگا یا فاسق، اگر فاسق ہے تو اس کی چھان بین کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، اور اگر وہ عادل ہے تو اس کے انذار کے قبول کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے طائفہ کے

انذار کی مخالفت سے ڈرایا ہے اور طائفہ کا اطلاق ایک پر بھی ہوتا ہے، اگر کوئی مسلمان ارضِ کفر میں داخل ہو اور اس نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے سامنے دین وشریعت کو پیش کیا، تو ان کے لیے اس کو قبول کرنا لازم ہے، اور یہ ان کے خلاف حجت ہوگی۔ (الاحکام: ۱/۱۰۰)

امام سرخسیؒ (م: ۴۵۰ھ) فرماتے ہیں: اگر خبرِ واحد وجوبِ عمل کے لیے حجت نہ ہوتی، تو انذار واجب نہ ہوتا اور انذار کا حکم حجت کے قائم ہو جانے کے بعد ہی ہوتا ہے، چناں چہ یہ اس بات پر دال ہے کہ خبرِ واحد موجبِ عمل ہے۔ (اصول سرخسی: ۱/۳۲۴)

(۲) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿واذ أخذ الله ميثاق الذين أوتوا الكتاب لتبيننه للناس ولا تكتمونه﴾. (آل عمران: ۱۸۷)

ترجمہ: اور جب اللہ نے عہد لیا کتاب والوں سے کہ اس کو بیان کرو گے لوگوں سے اور نہ چھپاؤ گے۔

بزدوی (م: ۴۸۲ھ) فرماتے ہیں کہ بیانِ کتاب کا حکم اور کتمان کی ممانعت ہر ایک کے لئے ہے اور ہر ایک اپنی کوشش کے بقدر مکلّف ہے اور کسی میں یہ استطاعت نہیں ہے کہ شرقاً وغرباً ہر ایک کے پاس تبلیغ کے لئے پہنچے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر ایک کے پاس جو امانت ہے اور اس کی ادائیگی سے متعلق جو وعدہ اس سے لیا گیا ہے، وہ اس کو پورا کرے۔ (فتح الملہم ۱/۲۲)

بیانِ کتاب کا حکم اور کتمان کی ممانعت اسی وقت درست ہوسکتی ہے جب کہ بیان

کرنے والے کی خبر کو موجبِ عمل گردانا جائے۔

الغرض اس آیتِ کریمہ سے بھی واضح ہوا کہ خبرِ واحد موجبِ عمل ہے۔

(۳) ارشادِ خداوندی ہے: ﴿**یأیها الذّین آمنوا ان جاء کم فاسق بنبأ فتبیّنوا أن تصیبوا قوماً بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم ندٰمین**﴾.

(الحجرات:٦)

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر آئے تمہارے پاس کوئی گنہگار خبر لے کر، تو تحقیق کرلو، کہیں جانہ پڑو کسی قوم پر نادانی سے، پھر کل کو اپنے کیئے پر لگو پچتانے۔

اور ایک قرأت میں ہے (فتثبتــــوا) چنانچہ جب فاسق کی خبر کے بارے میں تثبت کا حکم دیا جارہا ہے تو یہ اس بات پر دال ہے کہ عادل کی خبر اس کے خلاف ہے، ورنہ فاسق کی تخصیص کا کوئی مطلب نہیں تھا۔

نیز اگر خبر واحد مطلقاً مقبول نہ ہوتی تو فسق کہہ کر تثبت کی تعلیل کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اس لئے کہ علتِ رد اس میں فسق سے پہلے موجود ہے، چنانچہ یہ تحصیل حاصل ہوتا، یہ آیت بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خبرِ واحد موجبِ عمل ہے، بشرطیکہ وہ عادل کی ہو، فاسق و فاجر کی نہ ہو۔

(۴) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**فسئلوا أهل الذكر ان كنتم لاتعلمون**﴾. (النحل:۴۳)

ترجمہ: سو پوچھو یاد رکھنے والوں سے، اگر تم کو معلوم نہیں۔

یہاں اہل ذکر ایک کو بھی شامل ہے اور زیادہ کو بھی، یہ نہیں کہا کہ تمہارا سوال ان لوگوں سے ہو جو تواتر کی تعداد کو پہنچ جائے، چنانچہ جاہل کے لئے ضروری ہے کہ اہل علم میں سے جس کو وہ پائے اس سے سوال کرے۔

ناواقف کو اس آیت میں اہلِ علم سے سوال کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ اسی وقت درست ہوتا جب کہ اہلِ علم کی خبر کو موجبِ عمل قرار دیا جائے، معلوم ہوا کہ اہلِ علم کی خبر خواہ وہ حدِ تواتر کو پہنچی ہو یا حدِ تواتر کو نہ پہنچی ہو، حجت اور موجبِ عمل ہے۔

(۵) قرآنِ کریم میں ہے: ﴿**ان الذین یکتمون ما أنزلنا من البینٰت والهدیٰ من بعد ما بینٰه للناس في الکتٰب أولئک یلعنهم الله ویلعنهم اللٰعنون**﴾.(البقرہ:۱۵۹)

ترجمہ: بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اتارے صاف حکم اور ہدایت کی باتیں، بعد اس کے کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں، ان پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر وہ شخص جس نے دین کے کسی بھی حصہ کو چھپایا حالاں کہ اس کی ضرورت ہے، تو وہ اس وعید کا مستحق ہوگا، اب اگر اس کی خبر پر عمل واجب نہ ہو، تو اس کو ظاہر کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

الغرض جو شخص تتبع سے کام لے گا، وہ اور بھی بہت سی آیات پائے گا، جن سے

دلیل قطعی حاصل ہوتی ہے جیسے خبر واحد کی دلالت ان کے نزدیک ظنی ہے لیکن آحاد کے مختلف طرق جمع ہونے کے بعد وہ تواتر کو پہنچ جاتی ہے اسی طرح اس کی دلالت بھی قطعی ہوجاتی ہے۔

دلیل ثانیسنت نبویہ:

آقاﷺ سے خبر واحد کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا متعدد موقعہ پر ثابت ومشہور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء سابقین کی بعض ایسی حکایت بیان کی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے اخبار آحاد کو قبول کیا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے ایک آدمی کی خبر کو قبول کیا ہے، جس کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وجاء رجلمن أقصى المدينة يسعى قال يموسى ان الملأ يأتمرون بک ليقتلوک فاخرج اني لک من الناصحين .فخرج منها خائفاًيترقب﴾.(القصص:۲۰-۲۱)

ترجمہ:اور آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا کہا اے موسیٰ دوبارہ مشورہ کرتے ہیں تجھ پر کہ تجھ کو مار ڈالیں سو نکل جا میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں، پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا راہ دیکھتا۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ نے بادشاہ کے قاصد کی خبر کو قبول کیا اور آپ نے اس سے کہا: **﴿ارجع الى ربک فسئله مابال النسوة التي قطعن أيديهن﴾** .(سورۂ یوسف:۵۰)

ترجمہ: لوٹ جا اپنے مالک کے پاس اور پوچھ اس سے کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹے تھے ہاتھ اپنے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آقا ﷺ نے فرمایا کہ اگر یوسف کی جگہ میں قیدخانہ میں ہوتا تو میں داعی کی دعوت قبول کر لیتا، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بیس سے زیادہ احادیث بیان کی ہے۔ (بخاری شریف: رقم ۷۲۴۶ سے برقم ۷۲۶۷ تک)

اب ہم اختصار کے ساتھ کچھ اور حدیث ذکر کرتے ہیں تاکہ اس کی دلالت کی طرف اشارہ آسان ہو جائے۔

(۱) حدیث مالک بن حویرثؓ جب آقا ﷺ کی خدمت میں اپنی قوم کے ساتھ تشریف لائے، تو آقا ﷺ نے ان کو نصیحت فرمائی پھر فرمایا: جب نماز کا وقت ہو جائے، تو تم میں سے کوئی ایک اذان دے اور تم میں جو باعتبار علم و عمر کے سب سے زیادہ بڑا ہو، وہ امامت کرے۔ (بخاری شریف: کتاب اخبار الآحاد، باب ما جاء فی اجازۃ خبر الواحد الصدوق..، رقم ۷۲۴۶)

(۲) عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ آقا ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کسی کو بلال کی اذان اس کی سحری سے روک نہ دے، کیونکہ وہ تو رات میں اذان دیتے ہیں تاکہ تم میں جو نماز میں مشغول ہو، وہ گھر کی طرف لوٹ جائے اور جو سویا ہوا ہو، وہ بیدار ہو جائے۔ (بخاری شریف: کتاب اخبار الآحاد، باب ما جاء فی اجازۃ خبر الواحد الصدوق..رقم ۷۲۴۷)

(۳) ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ آقا ﷺ نے فرمایا: بلال رات میں اذان دیتے ہیں، چنانچہ کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔ (بخاری شریف: کتاب اخبار

الآحاد، باب ماجاء فی اجازۃ خبر الواحد الصدوق..، رقم ۷۲۴۸)

یہ احادیث اس بات پر دال ہیں کہ مؤذن کی نداء کی تصدیق کی جائے، حالانکہ وہ ایک ہی ہے، اب چاہے عمل اس کی خبر پر فعل صلاۃ سے متعلق ہو، یا دخول وقت صلاۃ سے متعلق ہو یا پھر افطار و امساک سے متعلق۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر زمانہ اور جگہ میں مسلمان ہمیشہ مؤذنین کی اتباع کرتے آئے ہیں، اسی طرح دیگر عبادات کے اوقات کے سلسلہ میں ان کی اذان پر عمل کرتے آئے ہیں جو واضح طور پر دال ہے کہ خبرِ واحد موجبِ عمل ہے۔

حجیت خبر واحد پر امام شافعیؒ کا استدلال:

امام شافعیؒ (م:۲۰۴ھ) اپنی مشہور کتاب "الرسالہ" میں "الحجۃ" کے زیر عنوان خبر واحد کی حجیت ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ایک شخص نے مجھ سے کہا کسی آیت، حدیث یا اجماع کی دلیل سے خبر واحد کی حجیت ثابت کیجئے، میں نے کہا: سفیان عبدالملک بن عمیر سے وہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود سے اور وہ اپنے والد عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بندہ کو خوش وخرم رکھے، جس نے میری بات سن کر اسے یاد رکھا اور آگے پہونچایا، علم کے بعض حاملین فقیہ نہیں ہوتے اور ایسے اشخاص تک علم کو پہونچاتے ہیں، جو اُن سے بڑھ کر فقیہ ہوتے ہیں، تین باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں کوئی مسلم خیانت نہیں کرسکتا (۱) خالص رضائے الٰہی کے لئے نیک کام کرنا (۲) مسلمانوں کی خیر خواہی و ہمدردی رکھنا (۳) مسلمانوں کی

جماعت کے ساتھ وابستہ رہنا، کیونکہ ان کی دعاء میں سب مسلمان شریک ہوتے ہیں۔

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات کو سننے، انہیں یاد رکھنے اور ایسے شخص تک پہونچانے کا حکم دیا ہے، جو انہیں آگے لوگوں تک پہونچادے۔

ظاہر ہے کہ جس شخص تک آپ کی بات پہونچائی جائے گی، وہ ایک بھی ہوسکتا ہے، جس کی بات دوسروں کے نزدیک واجب التسلیم حجت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کا جو ارشاد بھی دوسروں تک پہونچایا جائے گا، اس میں کسی حلال چیز کا ذکر ہوگا، جس کو استعمال کیا جاتا ہے، یا کوئی حرام چیز مذکور ہوگی جس سے پرہیز ضروری ہے، یا شرعی سزا یا مال کے لینے دینے کا ذکر ہوگا، یا دین و دنیا کے بارے میں حضور ﷺ نے کوئی نصیحت فرمائی ہوگی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اشخاص علم کے حامل تو ہوتے ہیں مگر عالم نہیں ہوتے، ان کو نبی اکرم ﷺ کے الفاظ ضرور یاد ہوتے ہیں؛ مگر وہ ان کا مفہوم نہیں سمجھتے، حضور ﷺ نے مسلمانوں کی جماعت سے وابستہ رہنے کا حکم بھی دیا ہے، جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا اجماع لازم الاتباع حجت ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں ہم نے امام مالک سے انہوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے سنا کہ لوگ مسجد قباء میں نماز فجر ادا کررہے تھے کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ نبی اکرم ﷺ کو بیت اللہ کی جانب نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، تم بھی اس طرف مڑ جاؤ، صحابہ کرام بیت المقدس کی جانب رخ کرکے نماز ادا کررہے تھے، وہ یہ سن کر قبلہ رخ ہوگئے، ظاہر ہے کہ اہل قباء سابق الاسلام اور اصحاب علم تھے، وہ بیت المقدس کی جانب رخ کرکے نماز

ادا کر رہے تھے، جس کے لئے وہ منجانب اللہ مأمور تھے، وہ اس فریضۂ خداوندی کو اس وقت تک چھوڑ نہیں سکتے تھے، جب تک ان کو ایسا حکم نہ دیا جائے، جس کی وجہ سے ان پر اتمام حجت ہو سکے، نہ وہ بذات خود نبی ﷺ سے ملے اور نہ براہ راست تحویل قبلہ سے متعلق حکم آپ ﷺ کی زبان سے سنا، تمام لوگوں سے بھی انہوں نے تحویل قبلہ کے بارے میں کوئی خبر نہیں سنی تھی، صرف ایک آدمی کے کہنے پر -- جس کو وہ صادق القول سمجھتے تھے- ایک فریضہ کو ترک کر دیا اور حضور ﷺ سے جو خبر ان کو تحویل قبلہ کے متعلق ملی تھی، اس پر عمل کیا، اگر ایک شخص کی بات قابل عمل نہ ہوتی، تو وہ اس کے کہنے پر ہرگز قبلہ اولیٰ کو ترک نہ کرتے ۔وہ ایک عظیم دینی معاملہ کو اپنی رائے سے طے نہیں کر سکتے تھے۔ مزید برآں اگر تحویل قبلہ کے سلسلہ میں خبر واحد کا قبول کرنا ان کے لئے جائز نہ ہوتا تو رسول اکرم ﷺ ان پر عتاب فرماتے، مگر آپ ﷺ نے ان پر عتاب نہیں فرمایا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں امام مالکؒ نے بتایا انہوں نے اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ سے اور انہوں نے انس بن مالک سے سنا کہ وہ فرماتے ہیں کہ: میں ابو عبیدہ بن الجراح اور ابی بن کعب کو کھجور کی شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام ہوگئی ہے، ابو طلحہ نے انسؓ سے کہا کہ اٹھ کر شراب کے مٹکوں کو توڑ دیجئے، چنانچہ میں نے ایک پتھر مار کر توڑ دیا۔

ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں جن کا ذکر کیا گیا ہے، وہ نہایت جلیل القدر، قدیم الصحبت اور اصحاب علم وفضل تھے، کوئی عالم اس سے انکار نہیں کرسکتا، یہ بھی معلوم ہے کہ

شراب اس وقت حلال تھی اور لوگ شراب پیتے تھے۔

ایک ہی شخص آتا ہے اور ان کو حرمت خمر سے آگاہ کرتا ہے، یہ سن کر شراب کے مٹکوں کے مالک ابوطلحہ انسؓ کو مٹکے توڑنے کا حکم دیتے ہیں، حیرت کی بات ہے کہ نہ ابوطلحہ نے نہ ان سب نے، اور نہ ہی ان میں سے کسی اور نے یہ بات کہی کہ: ہم شراب کی حلّت سے آگاہ ہیں، ہم خود نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر دریافت کریں گے یا تمام لوگوں سے معلوم کریں گے۔ وہ ایک حلال چیز کو اس طرح انڈیل نہیں سکتے تھے کہ وہ ضائع ہو جائے، اگر خبر واحد ان کے نزدیک حجت نہ ہوتی تو وہ ایسا اقدام ہرگز نہ کرتے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں سرور کائنات ﷺ نے حضرت انسؓ کو حکم دیا کہ فلاں شخص کی بیوی کے پاس جایئے، اگر وہ زنا کا اعتراف کرلے، تو اسے سنگسار کردیجئے، چنانچہ اس عورت نے اعتراف جرم کیا اور اسے سنگسار کر دیا گیا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ایک شخص کا اعتراف حجت ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا، مختلف بلاد وقبائل کے حجاج آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور آپ ان کو نبی اکرم ﷺ کے بیان کردہ مناسک حج اور دیگر احکام بتاتے رہے، اسی حال میں حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو ایام حج میں مکہ بھیجا، حضرت علیؓ نے یوم النحر کے دن مجمع عام میں لوگوں کو سورۃ التوبہ کی آیت تلاوت کر کے سنائی، کئی باتوں کا حکم دیا اور بعض امور سے منع فرمایا

، مکہ والے حضرت ابوبکرؓ اور علیؓ کے علم و فضل اور امامت وصداقت سے آگاہ تھے، حاجیوں میں سے کوئی شخص اگر ان دونوں یا دونوں میں سے کسی ایک سے ناواقف بھی ہوتا، تو دوسرے لوگ اس کو ان کی صداقت سے آگاہ کردیتے، ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے ان دونوں بزرگوں کو الگ الگ اسی لئے بھیجا تھا کہ ایک شخص کی خبر سے حجت قائم ہوجاتی ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ ﷺ ان کو جداگانہ طور پر مکہ نہ بھیجتے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے مختلف اطراف واکناف میں عمّال وحکّام مقرر کرکے بھیجے تھے، ہم ان کے نام ومقام سے اچھی طرح باخبر ہیں، ان عمّال کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ متعینہ مقامات پر جاکر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پہونچائیں، چنانچہ انہوں نے ارشاد کی تعمیل کی، مگر بایں ہمہ ان میں سے کسی نے یہ بات بھی نہ کہی کہ آپ اکیلے ہیں، ہم آپ کی بات تسلیم نہیں کریں گے، جب تک براہِ راست نبی ﷺ سے یہ نہ سن لیں، ظاہر ہے کہ نبی ﷺ نے ان حضرات کو اطراف ملک میں اسی لئے بھیجا تھا کہ ان کے ذریعہ ان لوگوں پر حجت قائم کی جائے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ اوامر اور نواہی پر مشتمل خطوط اپنے عمّال کے نام بھیجتے رہے، آپ ﷺ کے کسی والی نے اس بناء پر حکم عدولی نہیں کی کہ صرف ایک قاصد یہ خط اس کے نام لایا ہے، حضور ﷺ ہمیشہ اسی قاصد کو کسی علاقہ میں بھیجتے تھے جس کے رہنے والے اس کو صادق القول تصور کرتے ہوں، حضور ﷺ کے خلفاء راشدین اور ان کے عمال اور حکام کا بھی یہی طریقہ رہا، مسلمانوں کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ خلیفہ

ایک ہو، قاضی بھی ایک، امیر بھی ایک، اور امام بھی ایک ہو، یہ سب امیر ہو یا قاضی مقدمات فیصل کرتے اور ان کے احکام نافذ ہوتے، یہ شرعی سزائیں بھی دیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ ان کے احکام بھی ایک طرح کی خبر ہی تھے، (اور وہ نافذ ہوا کرتے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ خبر واحد کو ہمیشہ حجت قرار دیا گیا ہے۔ (الرسالہ ص/۴۰۱)

مناظرۂ امام شافعی رحمہ اللہ:

اس سلسلہ میں حضرت امام شافعیؒ اور ایک منکر حدیث کے درمیان پیش آنے والا ایک دلچسپ مناظرہ کا ذکر یہاں مفید ہوگا۔

امام شافعیؒ سے خبر واحد کے انکار کرنے والے ایک شخص نے پوچھا کہ محل یقین میں ظن پر فیصلہ کرنا کیوں کر جائز ہوگا؟ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک چیز جو دلیل قطعی سے حرام ہو کسی دلیل ظنی کے ذریعہ حلال ہوجائے؟

امام شافعیؒ: جی ہاں!

منکر حدیث: وہ کیا دلیل ہے؟

حضرت امام شافعیؒ: کیا خیال ہے تمہارا اس شخص کے بارے میں جو میرے پہلو میں بیٹھا ہے، کیا اسکا خون اور مال حرام ہے؟

منکر: ہاں حرام ہے۔

حضرت امام شافعیؒ: اگر دو گواہ اس کے خلاف گواہی دے کہ اس نے فلاں شخص کو قتل کیا ہے، اور اس کا مال لے لیا ہے اور یہی وہ مال ہے جو اس وقت اس کے

ہاتھ میں ہے۔

منکر: میں قصاص میں اسے قتل کرادوں گا، اور جو مال اس کے ہاتھ میں ہے وہ مشہود لہ کے ورثاء کو دلا دونگا۔

امام شافعیؒ: کیا اس بات کا احتمال نہیں کہ ان دونوں گواہوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہو؟ یا نادانستہ طور پر ان سے غلطی ہوئی ہو؟

منکر: یہ احتمال تو ضرور ہے۔

امام شافعیؒ: پھر کیسے وہ خون اور مال، جو دلیل قطعی سے حرام تھے صرف گواہوں کے ظنی بیان پر تم نے ان کو مباح کر دیا؟

منکر: مجھے گواہی قبول کرنے کا حکم ہے۔

امام شافعیؒ: اسی طرح خبر واحد کو قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (الرسالہ للامام الشافعی)

تیسری دلیل: اجماع

صحابہ، تابعین و تبع تابعین اور تمام ائمہ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اخبار آحاد احکام وعقائد دونوں میں حجت ہیں، قرآن کریم، سنت نبوی اور صحابہ میں سے کسی سے منقول نہیں کہ انہوں نے اخبار آحاد کو صرف احکام میں حجت مانا ہو اور عقائد میں حجت نہ مانا ہو اور ان کا یہ دعویٰ ہو کہ عقائد میں صرف احتجاج احادیث متواترہ سے ہی کیا جا سکتا ہے، نہ تو ان سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے سنت کو متواتر آحاد کی طرف منقسم کیا، چہ جائیکہ وہ اس کی شرط لگاتے اور یوں کہتے کہ بعض ادلہ وہ ہیں کہ جن سے احکام میں تو

عمل کیا جاسکتا ہے اور بعض وہ ہیں، جن سے عقائد میں صرف عمل کیا جاسکتا ہے ، حالانکہ ان شرطوں کی ضرورت فتنہ کے ظاہر ہونے اور لوگوں کے مخلوط روایت کو بیان کرنے یعنی ہر قسم کی روایت (چاہے ضعیف ہو یا موضوع) کے بعد پڑی۔

بلکہ حدیث نبوی ﷺ کی عظمت ان کے قلوب میں اس سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی کہ صرف توہمات کی بناء پر اس کو رد کردیں۔

اسی طرح صحابہ کا مرتبہ، ناقلین کا مرتبہ اور اس کی حمایت کرنے والوں کا مرتبہ ان کے نزدیک اس سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا کہ کوئی تہمت سرایت کر جائے یا ان میں سے کسی سے کہا جائے کہ آپ کی خبر واحد مفید علم نہیں ہے یا فروع میں مقبول نہیں ہے۔

انہوں نے بھی احادیث کی حفاظت میں تثبت سے کام لیا ہے اور بعض احادیثِ احکام میں تو ان سے شہادت بھی طلب کی گئی، جیسے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ سے شہادت طلب کی، تو حضرت ابوسعیدؓ نے آ کر شہادت دی، اسی طرح دیت جنین کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے پاس مغیرہ نے محمد بن مسلمہ کو پیش کیا اور میراث جدّہ اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں، جو اس پر دال ہیں کہ خبرِ واحد احکام وعقائد؛ دونوں میں قابلِ حجت ہے۔ اور ان میں سے کسی سے یہ منقول نہیں ہے کہ اخبارِ صفات یا معاد وغیرہ میں انہوں نے توقف سے کام لیا ہو؛ بلکہ ان سے یہ بات مشہور ومعروف ہے کہ انہوں نے عقائد کے سلسلہ میں بغیر تاویل وتعرض کے اس کو قبول کیا۔

ابن قیمؒ (م:۷۵۱ھ) فرماتے ہیں: کہ اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ اخبارِ آحاد احکام وعقائد میں قبول کی جائیں گی، یہی وجہ ہے کہ صحابہ نے اس طرح کی روایت کو نقل کیا ہے اور اس پر کسی نے نکیر نہیں کی، پھر ان سے تابعین نے، ان سے تبع تابعین نے اخذ کیا اور یہ سلسلہ چلتا رہا، ھلمّ جراً.

مزید فرماتے ہیں کہ اہل اسلام -متقدمین ومتأخرین- کا اس بات پر اجماع ہو چکا ہے اسی وجہ سے علماءِ متقدمین ومتاخرین صفات باری تعالیٰ، مسائل قدر، رؤیت، اصول ایمان، شفاعت وغیرہ میں اخبارِ آحاد کی روایت کرتے چلے آئے ہیں۔(مختصر الصواعق المرسلۃ:۶۰۸)

قاضی ابویعلیٰ (م:۷۵۸ھ) فرماتے ہیں کہ اخبار آحاد پر عمل ہمارے نزدیک سماعاً واجب ہے، اور تمام فقہاء ومتکلمین نیز جمہور سلف وخلف علماء کا معتمد مذہب بھی یہی ہے۔(العدۃ فی اصول الفقہ :۸۰۹/۳)

امام شوکانیؒ (م:۱۲۵۹ھ) فرماتے ہیں صحابہ وتابعین کا خبر واحد پر عمل کرنا شائع وزائع ہے اور کسی نے اس پر نکیر نہیں کی اگر کسی نے نکیر کی ہوتی، تو ہم تک منقول ہوتی لہٰذا یہ قولِ صریح کی طرح علم عادی کو واجب کرتی ہے۔(ارشاد الفحول:۲۵۳/۱)

دلیل رابع: قیاس

(ا) یہ ہے کہ ہر واقعہ میں روایات متواتر ومشہور نہیں پائی جاتیں، اگر خبر واحد کو رد کر دیا جائے تو بہت سے احکام میں تعطل لازم آئے گا۔

(۲) یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر مبعوث ہوئے اور یہ بات آپ ﷺ کے لئے ممکن نہیں کہ آپ تمام لوگوں کو بالمشاہدہ دعوت پہچائیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ آپ ہر جانب ایک بڑی تعداد بھیجیں، جو حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہو، چنانچہ اب ایک ہی صورت باقی ہے کہ آحاد پر اکتفاء کیا جائے، اب اگر ان کی خبر سے بھی امت پر عمل واجب نہ ہو، تو تبلیغ حاصل نہیں ہوگی اور نہ ان کے بھیجنے کا کوئی فائدہ ہوگا۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (م: ۱۳۶۹ھ) نے ''مقدمہ فتح الملہم''میں تحریر فرمایا ہے کہ عقل بھی اس بات کی مقتضی ہے کہ خبر واحد حجت ہو، چنانچہ فرماتے ہیں کہ خبر میں صدق وکذب دونوں کا احتمال ہے؛ لیکن عادل کی عدالت کی وجہ سے صفت صدق راجح ہے، لہذا رجحان صدق اس بات کا مقتضی ہے کہ عمل واجب ہو، تاکہ یہ حجت ہو سکے، چنانچہ جس طرح حکام کا فیصلہ صرف بینات کے ذریعہ صحیح ہے اور بینات کو ہی یقین کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور جس طرح قیاس کے ذریعہ غالب الرای پر عمل صحیح ہے، اسی طرح عادل کی خبر بھی غالب الرأی کی طرف نظر کرتے ہوئے علم کا فائدہ دے گی اور یہ عمل کے لئے کافی ہے۔ (مقدمہ فتح الملہم: ۱/۲۳)

چوتھا باب

کیا اخبار آحاد مفید یقین ہیں؟
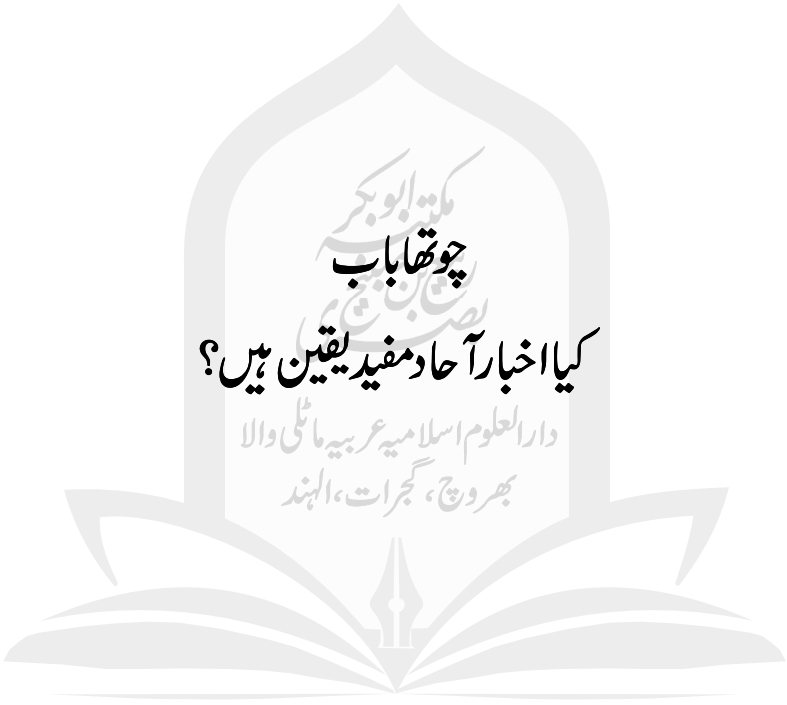
کیا اخبارآحاد مفید یقین ہیں؟

(۱) جمہور کی رائے یہ ہے کہ اخبارِآحاد مفید یقین نہیں ہیں، خواہ قرائن سے ملے ہوئے ہوں یا نہ ملے ہوئے ہوں بلکہ مفید ظن ہے؛ کیونکہ کبھی علم کا اطلاق کیا جاتا ہے اور اس سے ظن مراد لیا جاتا ہے جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿**فان علمتموهن مؤمنات أى ظننتموهن**﴾.(الممتحنۃ:۱۰)

(۲) ایک جماعت کا قول ہے کہ مطلقاً مفید یقین ہے، پھر اس جماعت میں دو گروہ ہیں، ایک گروہ قائل ہے کہ جب بھی خبر واحد پائی جائے گی وہ مفید یقین ہوگی، یہ بعض اہل ظاہر کا مذہب اور امام احمد کی دو روایتوں میں سے ایک روایت ہے، جب کہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ خبر واحد بعض اوقات ہی مفید یقین ہے، یہ بعض محدثین کا مذہب ہے۔

(۳) محققین -جن میں بعض حنابلہ جیسے: موافق ابن قدامہ، ابن عقیل، ابو البقاء، علامہ فخر الرازی اور ابن حاجب ہیں- کی رائے یہ ہے کہ اگر قرائن نہ ملے ہوں، تو مفید ظن ہے اور اگر قرائن ملے ہوں تو مفید یقین ہے، اور یہ یقین نظری ہوگا جو کہ غور وفکر اور استدلال سے حاصل ہوگا، یہی نظام اور ان کے متبعین کا مذہب ہے، اور یہی آمدی کا قول ہے۔(شرح الشرح ص/۲۱۵، احکام آمدی ۱/ ۲۱۸)

جمہور کے یہاں خبر واحد مفید ظن ہے؛ لیکن تمام ظن یکساں نہیں، بلکہ ان میں فرق مراتب ہیں، بعض بعض سے قوی ہیں، لہذا جس خبر واحد کے ساتھ قرینہ ملا ہو، وہ ظن قوی ہوگا

،اور جس کے ساتھ قرینہ نہ ملا ہو وہ خبر مفید ظن ہوگی، لیکن یہ ظن پہلی صورت کی طرح قوی نہ ہوگا۔ (القول المبتکر ص/۸۴)

دلائل محققین: ان حضرات کی دلیل ایک مثال ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خبر واحد کے ساتھ جب قرائن ملے ہوئے ہوں تو وہ مفید یقین ہے: فرض کریں اگر معتبر قاضی اپنی مجلس قضاء میں اپنے معاصرین اہل علم وفضل کی موجودگی میں بادشاہ وقت کے قاصد کو مخاطب کرتے ہوئے یہ خبر دے کہ ''زید کو عمرو نے میرے سامنے قتل کردیا ہے میری طرف سے بادشاہ کو خبر پہنچادو''، تو قاضی کی اس خبر سے سامعین کو یقین ہوجائے گا کہ زید کا قاتل عمرو ہی ہے، یہ احتمال تھا کہ قاضی اپنی بات میں جھوٹا ہو، لیکن مذکورہ قرائن کی وجہ سے یقین ہوگیا کہ زید کا قاتل عمرو ہی ہے۔ (عقدا لدرر:۱۷)

یہ مثال دال ہے کہ خبرِ واحد ___ قرینہ سے ملی ہو، تو مفیدِ یقین ہے۔

اور بغیر قرائن کے مفید یقین نہیں اس کو یوں سمجھیں کہ دو شخص متضاد چیزوں کی خبر دیں تو دونوں باتیں صحیح نہیں ہوسکتیں، یقیناً ایک صحیح اور غلط ہوگی، کون صحیح ہے اور کون غلط، اس پر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو خبر واحد بلا قرینہ ہو وہ مفید یقین نہیں۔

جمہور کی دلیل

جمہور کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح خبر واحد کا بلا قرینہ مفید یقین ہونا اس لئے باطل ہے کہ معلوم ویقین میں تناقض لازم آئے گا، اگر دو شخص متضاد چیزوں کی

خبر دیں، اسی طرح قرینہ کے ساتھ بھی تناقض لازم آتا ہے، چنانچہ مفید ظن ہونا دونوں حالتوں میں متعین ہے۔ (شرح الشرح:۲۱۶)

دونوں کے مابین ابن حجرؒ کی تطبیق:

لیکن ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ اختلاف لفظی ہے نہ کہ حقیقی، اس لئے کہ محققین نے جو کہا کہ خبر واحد مفید علم ہے، ان کی مراد علم سے علم نظری ہے اور جمہور نے جو کہا کہ خبر واحد مفید علم نہیں اور لفظ علم کو متواتر کے ساتھ خاص کیا، ان کی مراد یہ ہے کہ متواتر کے علاوہ تمام اخبار آحاد اپنی ذات کے اعتبار سے مفید ظن ہیں اور چونکہ انہوں نے اس بات کی نفی نہیں کی ہے کہ جو خبر واحد قرائن کے ساتھ ملی ہو، وہ راجح ہوگی، اس خبر واحد کے مقابلہ میں، جو قرائن سے خالی ہو، اس لئے محتف بالقرائن ان کے نزدیک بھی مرتبہ افادۂ ظن سے ترقی کر کے افادۂ علم ویقین کے مرتبہ کو پہنچ جاتی ہے؛ لہذا دونوں میں حقیقی اختلاف نہ رہا۔

قرائن کے اقسام

قرائن کی دو قسمیں ہیں: (۱) متصلہ (۲) منفصلہ۔

علامہ ابن حجرؒ نے شرح نخبۃ میں محتف بالقرائن کی چند قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) وہ اخبار آحاد، جن کی شیخین یعنی امام بخاریؒ ومسلمؒ نے اپنی صحیح میں تخریج کی ہو، اور حفاظ حدیث وائمۂ جرح وتعدیل میں سے کسی نے ان پر جرح ونقد نہ کی ہو، اور ان کے مدلول میں باہم ایسا تعارض نہ ہو، جس کا ازالہ ناممکن ہو، اس پہلی قسم

کے ساتھ تین قرائن پائے جاتے ہیں۔(۱) علم حدیث ونقد رجال میں شیخین کی عظمت وجلالت شان ۔ (۲) حدیث صحیح کو سقیم سے ممتاز کرنے میں ان کا اپنے معاصرین ومتأخرین سے فائق ہونا۔(۳) علماء کا صحیحین کو قبولیت سے نوازنا، چونکہ صحیحین کی اخبار آحاد میں مذکورہ تین قرائن پائے جاتے ہیں، اس لئے وہ افادۂ ظن سے ترقی کرکے افادۂ یقین نظری کے مرتبہ کو پہنچ جاتی ہیں؛ بلکہ ان قرائن میں سے تیسرا قرینہ یقین وعلم نظری کا فائدہ دیتا ہے، الغرض اخبارِ آحاد جن کی تخریج شیخین نے کی ہو، شیخین کے علاوہ تخریج کردہ ان بہت سی اخبار سے قوی ومضبوط ہیں جو کہ حدتواتر کو نہ پہنچی ہوں؛ لیکن اگر شیخین کے علاوہ کی حدیث حدتواتر کو پہنچ چکی ہو، تو وہ شیخین کی اخبار آحاد سے راجح ومضبوط ہوگی۔

(۲) محتف بالقرائن کی دوسری قسم: وہ خبر مشہور ہے، جس کی ایسی بہت سی سندیں ہوں کہ راویوں کی کمزوری اور خرابیوں سے پاک ہو، اس قسم کی خبر واحد میں مشہور ہونا ایک قرینہ ہے، جس کی وجہ سے وہ مفید علم نظری ہوگی ،استاذ ابومنصور بغدادی (م:۴۲۹ھ) اوراستاذ ابوبکر بن فورک (م:۴۰۶ھ) وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ یہ قسم علم نظری کا فائدہ دے گی۔

(۳) محتف بالقرائن کی تیسری قسم: وہ حدیث مسلسل ہے، جس کو ایسے ائمہ وحفاظ حدیث روایت کریں جو صاحبِ ضبط واتقان ہوں اور وہ حدیث عزیز ہو، اس حدیث سے محققین کے نزدیک سامع کو علم نظری حاصل ہوگا، مثلاً کوئی حدیث اس سند سے مروی

ہو،أحمد بن حنبل عن الشافعی عن مالک بن أنس عن نافع عن ابن عمر ، اور مذکورہ تمام حضرات اپنے اساتذہ سے روایت کرنے میں منفرد نہ ہوں، مذکورہ سند کے تمام رواۃ امانت ،ضبط واتقان وغیرہ تمام صفات میں اس قدر مضبوط ہیں، جو عدد کثیر کے قائم مقام ہے اور جو روایت ایسے درجہ کی ہو، ان کی خبر سچی ہوتی ہے، لہذا ان کی خبر سچی ہے، البتہ اس بات کا امکان تھا کہ ان کی جلالت شان کے باوجود ان سے سہو ونسیان ہوگیا ہو؟ اس امکان کا راستہ بھی اس شرط کے ساتھ بند کر دیا کہ مذکورہ حضرات روایت میں منفرد نہ ہوں، لہذا یقیناً وہ مفید علم نظری ہوگا۔ (شرح نخبہ:۵)

(۲) قرائن منفصلہ:

وہ قرینہ ہے جس کا اخبارِ آحاد سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں، چناں چہ اخبارِ نبوی اور اخبارِ غیر کے مابین فرق ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں رجال کو پیدا کیا، جنہوں نے اس کو برابر محفوظ رکھا اور ان اخبار کے ثبوت و بطلان کو جاننے کے لیے چند اصول وقواعد اختیار فرمائے ہیں۔

چناں چہ ابن قیمؒ (م:۷۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ: خبرِ واحد چند جگہوں میں مفیدِ علم ہے۔

(۱) اس آدمی کی خبر، ہو جو اپنی خبر پر دلیل قطعی قائم کرے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خبر ہے۔

(۲) اس آدمی کی خبر جو نبی کی موجودگی میں ہو اور آپ ﷺ اس کی تصدیق بھی

کریں، جیسے:"إن اللـه يـضـع السمٰوات على اصبع والأرضين على اصبع والشجر على اصبع......". چناں چہ آقاﷺ بطورِ تعجب ہنس پڑے، اوران کی بات کی تصدیق فرمائی۔ (بخاری شریف: کتاب التفسیر، باب قولہ تعالیٰ: وماقدرواالله حق قدره)

اسی طرح آقاﷺ نے اپنے اصحاب کی بات کی تصدیق فرمائی جیسا کہ تمیم داریؓ کی دجال کے قصہ کے بارے میں تصدیق فرمائی (مسلم شریف، ابوداود) اوراس بات کوآپ نے منبر پر بیان فرمایااوریوں نہیں فرمایا کہ "اخبرني جبرئيل" بلکہ فرمایا: "حدثني تميم الداري"، جس شخص کوبھی حدیث اورسنت کے ساتھ ادنیٰ بھی ممارست ہوگی، وہ اوربھی بہت سی مثالیں پائے گا، جن میں آقا نے اپنے اصحاب کی بات کی تصدیق فرمائی۔

(۳) ایک آدمی کسی بات کی خبر دے اور متعدد لوگ اس بات کا دعویٰ کریں کہ انہوں نے اس بات کواس آدمی سے سنا ہے اوران میں سے کسی نے نکیر نہیں کی، تو یہ اس بات پردال ہے وہ سچا ہے۔ (مختصر الصواعق المرسلۃ: ۱/۶۰۸)

خلاصۂ کلام یہ کہ قولِ ثانی بھی درحقیقت قولِ اول کے تحت داخل ہے، اس لیے کہ وہ قرائن جس کی قولِ ثانی کے قائلین نے شرط لگائی ہے، اس کی قولِ اول کے قائلین بھی شرط لگاتے ہیں، خصوصا قرائنِ متصلہ، رہی بات منفصلہ کی تو اس کا بطلان تو ظاہر ہے؛ لیکن مختلف کتابوں میں اس کوقولِ ثانی اورقولِ مستقل قرار دیا گیا ہے۔ والله أعلم.

کیا صحیحین کی احادیث مفید قطع ویقین ہیں؟

حافظ ابن صلاح (م:٦٤٢ھ) نے اپنے مقدمہ میں فرق مراتب کے ساتھ احادیث کی ایک ہفت گانہ تقسیم کی ہے، ساتوں قسم کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ان سات قسموں میں سے اعلیٰ قسم کی صحیح حدیث وہ ہے، جس کے اخراج پر بخاری و مسلم متفق ہوں اور یہ پوری قسم مفید قطع اور مفید علم یقینی ہے، اگر چہ یہ علم یقینی نظری ہے؛ کیونکہ پوری امت اس بات پر متفق ہے کہ بخاری و مسلم کی حدیثیں صحیح ہیں، اور ان کی احادیث شرائط صحت کی جامع ہیں، گویا اجتماعی طور پر امت کا یہ فیصلہ ہے اور امت بحیثیت مجموعی خطا سے محفوظ ہے، جس طرح وہ اجماع – جو اجتہاد پر مبنی ہو- حجت قطعی ہوتا ہے، اسی طرح حدیث کی یہ قسم بھی حجت قطعی ہوگی، ابن صلاح کی اس رائے کو بہت سے علماء مثلاً ابن تیمیہؒ، حافظ ابن حجرؒ اور حافظ بلقینی وغیرہ نے قبول کیا ہے۔ (مقدمہ ابن صلاح:١٢)

جب کہ امام نووی (م:٦٧٦ھ) نے مقدمہ کی تلخیص "التقریب والتیسیر" میں اور شرح مسلم کے مقدمہ میں شد و مد کے ساتھ اس نظریہ کی تردید فرمائی ہے، انہوں نے ذکر کیا ہے کہ صحیحین کی جو احادیث متواتر نہیں ہیں، وہ خبر واحد ہیں اور اخبار آحاد ظنی ہوتی ہیں اور امت کے ان حدیثوں پر اجماع سے اور تلقی بالقبول سے صرف اتنی بات ثابت ہوئی کہ یہ احادیث واجب العمل ہیں اور ان کی صحت جانچنے کے لئے اب مزید کسی کوشش کی ضرورت نہیں ورنہ وہ حدیث جو شرائطِ صحت کی جامع ہو، خواہ صحیحین کی ہو، یا غیر صحیحین کی، مفید ظن اور واجب العمل ہوتی ہے، صحیحین اور غیر صحیحین میں صرف فرق اتنا ہے کہ شیخین کی شان علمی اور مہارتِ فنی کی وجہ سے ان کی حدیثیں

بے کھٹک صحیح ہیں، نظر کی محتاج نہیں، جب کہ غیر صحیحین کی احادیث نظر وفکر کی محتاج ہیں، نظر وفکر کے بعد شرائط صحت کا جامع ہونا جب معلوم ہو جائے، تو پھر ان میں اور صحیحین کی حدیثوں میں صحت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں رہتا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ نے ایک عجیب بات اس موقع پر فرمائی، فرماتے ہیں: ''صحیحین کو ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یقین حاصل ہو گیا کہ یہ دونوں کتابیں بے شک شیخین کی ہیں اور ان کی احادیث شرائط صحت کی جامع ہیں اور خبر واحد ہیں اور مفید ظن ہیں یعنی تلقی بالقبول سے ان کی حدیثوں کے مفید قطع ویقین ہونے کا فائدہ حاصل ہونے کے بجائے ان کی مفید ظن ہونے میں اور تقویت پیدا ہوگی۔

اس لئے کہ محدثین کا کسی حدیث کے سلسلہ میں یہ اتفاق کر لینا کہ وہ اصطلاحی اعتبار سے صحیح ہے اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ یقینی طور پر رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے اور قطعی طور پر واجب العمل ہے، برخلاف اس صورت کے کہ کسی متعین حدیث کے مضمون پر اور اس کے مطابق عمل پر اجماع ہو جائے، تو یہ بات یقیناً اس کو مستلزم ہے کہ وہ واجب العمل ہے اور کسی حال میں چھوڑی نہیں جا سکتی، اگر چہ اس کی سند ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔

پھر ایک بات قابل غور ہے کہ امت کا اجماع اس بات پر بھی ہے کہ یہ دونوں کتابیں ''اصح الکتب'' ہیں، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کی ہر ہر حدیث اپنی اپنی جگہ پر غیر صحیحین کی ہر ہر حدیث کے بالمقابل اصح ہے، جس طرح وہ لوگ جو بخاری کو

مسلم پر فوقیت دیتے ہیں، ان کے پیش نظر ہرگز یہ بات نہیں ہوتی کہ بخاری کی ہر حدیث مسلم کی ہر حدیث سے اصح ہے۔

چنانچہ ابن حجرؒ نخبہ میں فرماتے ہیں: **"قد یعرض ا لمفوق ما یجعله فائقا"** یعنی بسا اوقات نیچے درجہ کی حدیث کو ایسے مؤیدات حاصل ہوجاتے ہیں، جو اس کو اس سے بلند تر مرتبہ حدیث پر فوقیت دے دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ خود ابن صلاح بھی قطعیت کے دعویٰ کے باوجود صحیحین کی ان احادیث کے استثناء پر مجبور ہوئے ،جن پر نقد کیا گیا ہے،اور فرمایا چونکہ نقد شدہ احادیث کی صحت پر اجماع منعقد نہیں ہوا اس لئے وہ قطعی نہیں ہیں۔

اس پر عرض ہے کہ جس عام میں سے بعض کی تخصیص کرلی جاتی ہے اس کا بقیہ حصہ ظنی ہوجاتا ہے،اس لئے بقیہ وہ حدیثیں،جن پر تنقید نہیں ہوئی ہے، وہ بھی مفید ظن ہوں گی ، کیونکہ امام دارقطنیؒ یا ان کے علاوہ محدثین نے جتنی حدیثوں پر نقد کیا ہے بیشتر کا تعلق اسناد سے ہے، جو ان کا فن ہے باقی درایت کے اصول کے مطابق صحیحین کی احادیث پر نقد کی گنجائش اب بھی موجود ہے،مثلاً کہا جاسکتا ہے کہ فلاں حدیث قرآن کے ظاہر کے خلاف ہے یا احادیث ثابتہ فی الباب کے معارض ہے یا شریعت میں ثابت شدہ مسلم قواعد کلیہ سے میل نہیں کھاتی وغیرہ، البتہ ان امور پر حدیثوں کو پرکھنا صرف بالغ نظر فقہاء کا کام ہے۔(مقدمۂ فتح الملہم :۱/ ۲۸۷)

اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مطلقاً بخاری ومسلم کی احادیث مفید علم ویقین نہیں ہاں بعض احادیث قرائن کلیہ میں گھیری ہوئی ہے کہ ان کے مفید علم ہونے سے انکار نہیں، مگر جب تک اس طرح کی احادیث کونشان زد کر کے مشخص نہیں کیا جاتا، تب تک یہ اجمالی حکم لگانا کہ صحیحین کی حدیثیں محتف بالقرائن ہونے کی وجہ سے مفید قطع ویقین ہوں گی غلط ہوگا۔

نوٹ: مذکورہ بالا معروضات سے ہمارہ مقصد صرف اندھی تقلید پر بند لگانا ہے، جس کے نتیجہ میں صحیحین کے علاوہ دیگر کتابوں کی صحیح حدیثیں بیک جنبش قلم وزبان رد کر دی جاتی ہیں، ورنہ مجموعی اعتبار سے صحیحین کا مرتبہ قرآن کے بعد ''اصح الکتب'' ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

پانچواں باب

کیا اخبار آحاد حجت نہیں؟:

دلائل وجوابات
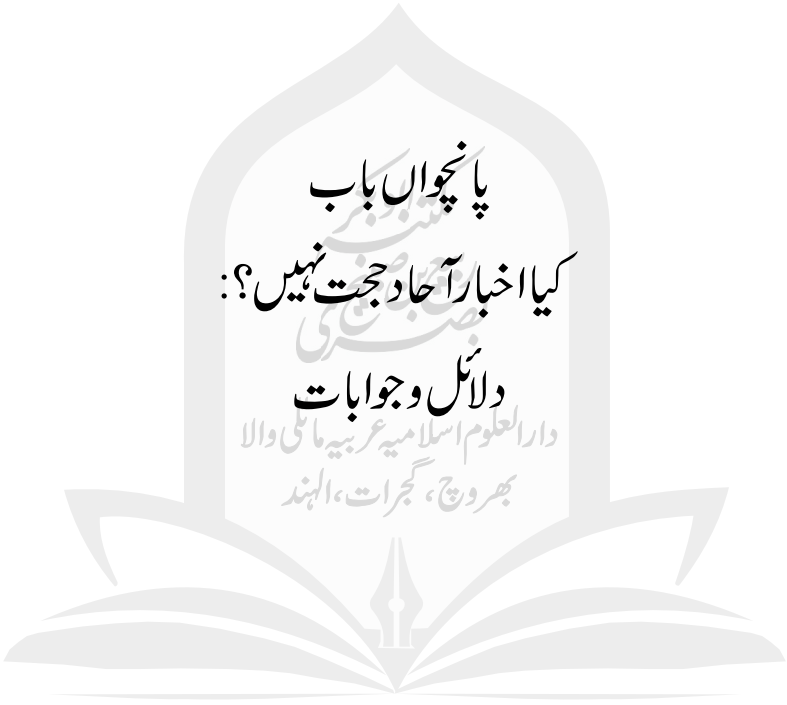
عدم حجیت کے قائلین کے دلائل اور اُن کے جوابات

کچھ لوگوں کا شبہ یہ ہے کہ اخبارِ آحاد مفیدِ ظن ہیں ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ روایت شہادت کی طرح ہے، لہٰذا جو چیزیں شہادت میں معتبر ہیں، وہی چیزیں روایت میں معتبر شمار ہوں گی۔

اس کے قائلین متاخرین معتزلہ، شیعہ اور جمہور قدریہ ہیں۔ (السنۃ ومکانتہا في التشریع الاسلامي: ۱۹۰)

امام ابن حزمؒ (م: ۴۵۶ھ) فرماتے ہیں: ثقہ کی خبرِ واحد کے قبول کرنے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے؛ لیکن ایک صدی بعد کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے، جنہوں نے اجماع کی مخالفت کی۔ (الاحکام: ۱/۱۰۷)

شیعہ میں سے شریف مرتضیٰ (م: ۴۳۶ھ) کا کہنا ہے کہ اخبار آحاد مطلقا حجت نہیں، اس طور پر کہ احکامِ شرعیہ میں ایسے طریق کا ہونا ضروری ہے جو **موصل إلی العلم** ہو، اور اخبار آحاد نہ موجبِ علم ہے اور نہ موجبِ علم، اس لیے کہ خبرِ واحد کا راوی صادق بھی ہوسکتا ہے اور کاذب بھی۔ (اصول الفقہ للمظفر الاسمعانی: ۱/۷۰)

جمہور مستشرقین یہود ونصاریٰ اور بعض مستغربین بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔ (تفصیل کے دیکھئے، السنۃ ومکانتہا في التشریع الاسلامي: مصطفیٰ السباعی)

پہلا اعتراض: منکرین حجیت اخبار آحاد کا کہنا ہے کہ اخبار آحاد خود محدثین کی

تصریح کے مطابق ظنی ہیں اور ظن کی پیروی قرآن کریم کی تصریح ﴿ان یتبعون الا الظن﴾ کے مطابق ممنوع ہے۔(النجم:۲۸)

لیکن ان کا یہ قول محض دجل و تلبیس ہے، واقعہ یہ ہے کہ لفظ ظن عربی زبان میں تین معانی کے لئے مستعمل ہے: (۱) اٹکل و تخمین (۲) ظن غالب (۳) علم یقینی استدلالی، خود قرآن کریم کی آیات ذیل میں ظن بمعنیٰ یقین مستعمل ہے: (۱) ''الذین یظنون أنهم ملقوا ربهم'' (البقرۃ:۲۶)

(۲) ﴿قال الذین یظنون أنهم ملقوا الله﴾ (البقرۃ:۲۴۹)

(۳) ﴿وظن داود أنما فتناه﴾. (ص:۲۴)

اخبارِ آحاد کو جو ظنی کہا جاتا ہے وہ اٹکل اور تخمین کے معنیٰ میں نہیں؛ بلکہ بعض جگہ ''ظن غالب'' اور بعض جگہ ''یقین'' کے معنیٰ میں ہوتا ہے، اور قرآن کریم میں جس ظن کی پیروی سے منع کیا گیا ہے، وہاں اس سے مراد اٹکل اور تخمین ہے، ورنہ جہاں تک ''ظن غالب'' کا تعلق ہے، شریعت کے بیشمار مسائل میں اسے حجت قرار دیا گیا ہے۔ اور حق یہی ہے کہ اسے حجت مانے بغیر انسان ہدایت کے ساتھ ایک لمحے کا بھی سفر نہیں کرسکتا، کیونکہ ساری دنیا اسی ''ظن غالب'' پر قائم ہے، حافظ ابن حجرؒ (م:۸۵۲ھ) نے لکھا ہے کہ اخبارِ آحاد اسی قسم کا ظن پیدا کرتی ہے؛ البتہ بعض اخبارِ آحاد جو مؤید بالقرائن ہوں، علم نظری کا فائدہ دیتی ہیں، مثلاً وہ احادیث جو مسلسل بالحفاظ والأئمۃ ہوں۔ (درسِ ترمذی ۱/۳۴)

دوسرا اعتراض: قال اللہ تعالیٰ: ﴿ولا تقف مالیس لک به علم﴾.

(النجم:۳۶)وقال تعالیٰ: ﴿ان الظن لایغنی من الحق شیئا﴾. (النجم:۲۸)

وہ کہتے ہیں کہ خبر واحد کا طریقہ یعنی سلسلۂ روایت ظنی ہے اس لئے کہ ہر راوی کے متعلق بھول جانے یا غلطی کرنے کا احتمال بہر حال موجود ہے اور جس دلیل کی صورت حال یہ ہو، وہ قطعی اور یقینی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ (کسی بھی مسئلہ میں) استدلال کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دین کی بنیاد، اصول (عقائد وغیرہ) اور قواعد عامہ کے بارے میں بیشک قطعی اور یقینی دلائل کا ہونا ضروری ہے؛ لیکن فروعی مسائل اور جزئیات دین کے بارے میں تو ظنِ غالب پر عمل کرنا واجب ہے، اس لئے کہ اس معاملہ میں ظن غالب پر عمل کرنے کے سوا کوئی دوسری راہ ہی نہیں، خود قرآن کی نصوص ہی کو لے لیجئے، ان کے معانی متعین کرنے میں کس قدر اختلاف آراء پایا جاتا ہے اور ائمۂ مجتہدین اس سلسلہ میں کس قدر ایک دوسرے سے مختلف مسلک اختیار کرتے ہیں؛ مگر کوئی ایک مجتہد بھی اپنے اجتہاد کو ظنی نہیں کہتا، باوجودیکہ ہر مجتہد کے اجتہاد سے جو حکم شرعی ثابت ہو، اس پر عمل کرنے کے واجب ہونے پر امت کا اجماع ہے؛ اس لئے کہ ظن غالب پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، (ورنہ قرآن پر عمل کرنا ممکن نہیں ہوگا) علاوہ ازیں خبر واحد خود اگرچہ ظنی ہے؛ مگر اس کا حجت شرعیہ ہونا دلیل ظنی سے ثابت نہیں ہے؛ بلکہ دلیل قطعی سے ثابت ہے؛ اس لئے کہ اس پر نہ صرف اہلِ علم کا اجماع ہے؛ بلکہ خود صحابہ کرام کا اجماع ہے، اور صحابہ کا اجماع مسلم طور پر حجت قطعیہ ہے اور اس اجماع کی دوسرے

حضرات کی مخالفت سے اس پر کوئی ضرر نہیں پہونچ سکتا، لہذا خبر واحد پر عمل ظنی دلیل پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ ایسی یقینی دلیل پر مبنی ہے، جو قطعی اور یقینی ہے۔ (احکام آمدی، ۲۲۰/۱)

تیسرا اعتراض: اگر خبر واحد پر عمل فروعی مسائل میں جائز ہے تو اصول دین و عقائد میں بھی خبر واحد پر عمل جائز ہونا چاہئے، حالانکہ ہمارا اور تمہارا اس بات پر اجماع ہے کہ اخبار آحاد اصول وعقائد میں قبول نہیں کی جاتیں، تو فروعی مسائل میں بھی ایسا ہی ہونا چاہئے (یعنی خبر واحد اگر حجت شرعیہ ہے تو اصول وفروع دونوں میں ہونی چاہئے اور اگر حجت نہیں تو دونوں میں نہ ہونی چاہئے، یہ تفریق کیوں اور کہاں سے آئی؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس پر تو امت کا اجماع ہے کہ دین کے اصول اور عقائد میں ظنی دلیل کو قطعاً قبول نہیں کیا جائے گا؛ لیکن فروعی احکام کے بارے میں ایسا کوئی اجماع نہیں ہے۔ آمدی لکھتے ہیں: مخالفین کی یہ دلیل (کہ اصول اور فروع دونوں کا حکم یکساں ہونا چاہئے) فتویٰ اور شہادت کے بارے میں خبر واحد کے مقبول ہونے سے ٹوٹ جاتی ہے، (یعنی فتووں میں بھی خبر واحد سب کے نزدیک مقبول ہے اور شہادت میں بھی، تو اگر فروع کا حکم بھی وہ ہی ہوتا جو اصول کا ہے تو نہ فتوی میں خبر واحد قبول ہونی چاہئے تھی نہ شہادت میں) تو پھر اصول اور فروع کے درمیان یہ فرق کیوں کر مسلم ہوگا جب کہ وہ موجود ہے، اصل یہ ہے کہ رسول کی رسالت اور دین کے عقائد کے ثبوت کے لئے قطعی دلیل کا ہونا ضروری ہے؛ اس لئے کہ اس میں ظنی دلیل معتبر نہیں ہے، فروعی مسائل واحکام کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ ان کے ثبوت میں قطعی دلیل

کا ہونا شرط نہیں ہے۔ (الاحکام لآمدی:۱/۲۲۱)

حق یہ کہ فروعی احکام ومسائل کو اصول دین پر قیاس کرنا سینہ زوری ہے؛ کیوں کہ اصول اورفروع کے درمیان تفریق مسلّم شئے ہے۔

چوتھا اعتراض: صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے بھول کرظہر یاعصر کی نماز میں دورکعت پرسلام پھیردیا اورذوالیدین نے آپ ﷺ کو یہ کہہ کرکہ ''یارسول اللہ نماز میں کچھ کمی ہوئی یا آپ بھول گئے ہیں''، آپ ﷺ نسیان سے آگاہ کیا، تو آپ نے ذوالیدین کی خبرقبول کرنے میں توقف کیا اوراس وقت تک ذوالیدین کی خبرقبول نہ فرمائی، جب تک کہ حضرت ابوبکروعمرؓ اوران کے علاوہ صف اول کے مقتدیوں نے اس کی تصدیق نہ کردی، اس کے بعد آپ نے نماز پوری فرمائی اور سجدۂ سہوکیا، اگرخبرواحد حجت ہوتی اوراس پرعمل کرنا واجب ہوتا، تو آپ بلاتوقف اور بغیرسوال کے حضرت ذوالیدین کے بیان پراعتماد کرکےنماز پوری فرمالیتے؟

جواب یہ کہ آپ ﷺ نے ذوالیدین کی خبرمیں توقف صرف اس لئے فرمایا تھا کہ آپ کو بجاطور پرذوالیدین کے متعلق خطاء یانسیان کا گمان تھا؛ اس لئے کہ صحابۂ کرام کے اتنے بڑے مجمع میں سے سوائے ذوالیدین کے کسی نے بھی آپ ﷺ کونہیں ٹوکا، سب خاموش تھے، اس لئے ذوالیدین کے متعلق وہم کا گمان بالکل قرینۂ قیاس تھا اور یہ توعلم اصول کا قاعدہ ہے کہ اگرخبرواحد میں وہم کی علامت پائی جائے، تواس کے قبول کرنے میں توقف ضروری ہے۔

پانچواں اعتراض: متعدد صحابہ سے بھی خبر واحد کو قبول نہ کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا مروی ہے؛ چنانچہ:

(۱) جب حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جدہ کی میراث کا مسئلہ آیا، تو آپ نے تنہاء حضرت مغیرہ کی خبر کو رد کر دیا اور اس وقت تک اس پر عمل نہیں کیا جب تک کہ محمد بن مسلمہ کی حدیث سے اس کی تائید نہ ہو گئی، اگر خبر واحد حجت ہوتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تنہا حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی خبر کو قبول کر لیتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ سے خبر واحد پر عمل کرنا ثابت ہے اور بطریق تواتر ثابت ہے، ہاں جن اخبار آحاد میں ان سے توقف مروی ہے یہ انکے عدم قبول پر ہرگز دلیل نہیں ہو سکتی، بلکہ انکا توقف چند وجوہات پر مبنی ہے۔
(۱) شک (۲) وہم (۳) یا بات میں مزید پختگی کی خواہش۔ یہاں ابوبکرؓ کا توقف مزید تائید و توثیق کے لئے تھا. اس لئے کہ ہر وہ چیز، جس کی صراحت قرآن میں نہ ہو، اس میں احتیاط اور تثبت ضروری ہے۔ (منہج النقد عند المحدثین ص/۵۰)

حاکم اس روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **أول من وقى الكذب عن رسول الله ﷺ أبو بكر (المدخل: ۴۶)** اور ذہبی نے کہا: **كان أبوبكر أول من احتا ط في قبوله الأخبار.** (تذکرۃ الحفاظ: ۲۷)

(۲) اسی طرح حضرت عمرؓ نے استیذان (مکان کے اندر آنے کی اجازت) کے مسئلہ میں ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث کو اس وقت تک قبول نہیں کیا؛ جب تک کہ

حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث سے اس کی تائید نہ ہوگئی۔ حضرت عمرؓ کے ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث کو قبول نہ کرنے کی توجیہ بھی یہی ہے۔ درحقیقت حضرات شیخینؓ کا قبول حدیث کے بارے میں یہ طرزِ عمل ایک عظیم اور مؤثر درس ہے دوسرے صحابہ کے لئے، ان کے بعد آنے والے محدثین کے لئے اور نوآموز حضرات کیلئے، جن کی ذہنی تربیت کماحقہ نہیں ہوئی تھی، یا جو اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے،اسی لئے تو حضرت عمرؓ نے ابوسعید خدریؓ کی شہادت کے بعد ابوموسیٰ اشعری سے کہا تھا: یاد رکھو تم میرے اس طرزِ عمل سے یہ نہ سمجھ لینا کہ روایت حدیث کے باب میں تم کو متہم سمجھتا ہوں، بلکہ میرے بھائی! رسول ﷺ کی حدیث ہے اس میں امکان بھر احتیاط کی ضرورت ہے۔

(۳) حضرت ابوبکر و عمرؓ نے حکم بن العاص کے مدینہ واپس آنے کے بارے میں نبی ﷺ کے اذن سے متعلق حضرت عثمانؓ کی حدیث قبول نہیں کی۔

(۴) حضرت علیؓ نے مفوضہ (وہ عورت جس کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے) کے مسئلہ میں ابوسفیان اشجعی کی حدیث قبول نہیں کی۔

(۵) حضرت عائشہؓ نے عبداللہ بن عمر کی اس حدیث کو نہیں مانا کہ میت کے گھر والوں کے رونے دھونے سے میت کو عذاب ہوتا ہے۔

آمدی لکھتے ہیں: کہ جن حدیثوں کو صحابہ نے رد کیا یا ان کو قبول کرنے میں توقف کیا، اس کی وجہ ایسے امور ہوئے؛ جن کا تقاضہ یہی تھا، مثلاً اس حدیث کے معارض دوسری

کوئی حدیث موجودتھی یا قبول حدیث کی کوئی شرط پوری نہیں ہورہی تھی ،نہ یہ کہ وہ سرے سے خبر واحد سے استدلال کرنے کے مخالف تھے ،دراں حالانکہ صحابہ تو ایک دوسرے کی بیان کردہ حدیث کے قبول کرنے کے بارے میں بالکل متفق تھے؛ اسی لئے تو ہمارا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن وحدیث کی تمام واضح نصوص حجت شرعیہ ہیں، اگر چہ خارجی امور کی بنا پر کسی حدیث کو چھوڑ دینا یا اس کے قبول کرنے میں توقف کرنا بھی جائز ہے ۔(احکام آمدی:۱/۲۲۱)

عدمِ حجیت کے قائلین کی ایک دلیل قیاس سے ہے: چناں چہ انہوں نے روایت کو شہادت پر قیاس کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح ایک آدمی کی گواہی احکام میں معتبر نہیں ہے، اسی طرح خبرِ واحد بھی مقبول نہیں ہے، چوں کہ خبرِ واحد موجبِ علم وعمل نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خبر واحد کو شہادت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے چوں کہ روایت وشہادت کے مابین بہت زیادہ تفاوت ہے۔(الکفایۃ:۷۵)

بہرحال حجیت خبر واحد کے منکرین کے یہ شبہات اوران کے جوابات ہیں، جوعلماء اصول نے اصول کی کتابوں میں بیان کئے ہیں، اب ہم ذیل میں ان دلائل کا تذکرہ کرتے ہیں، جن سے اس بات پر حجت قائم ہوتی ہے کہ اخبار آحاد واجب العمل ہے .جب اخبار آحاد کا صحیح ہونا ثابت ہوجائے تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس کی مخالفت کرے۔

خلاصۂ کلام:

(۱) خبر آحاد کو قبول کرنا نبی ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک برابر چلا آ رہا ہے، پھر یہ کہنا کہ یہ خبر واحد ہے، تو اس میں کذب کا احتمال ہے، یا ظن راجح ہے، یہ انتہائی ہٹ دھرمی ہے، اس سے بہت سے علوم حتیٰ کہ قرآن کریم وسنت رسول کا بھی انکار لازم آتا ہے، یہ تو ایسا ہی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کا انکار کیا جائے۔

(۲) ہر تلمیذ اپنے استاذ سے ہر قسم کے علوم حاصل کرتا ہے، اور اس کی بنیاد اعتماد واعتقاد ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اخبارِ آحاد تو مفید ظن ہے، اس لیے وہ واجب العمل نہیں، تو اس وقت دو چیزوں میں سے ایک چیز لازمی ہے۔

(۱) تمام وہ چیزیں جس کو اس نے حاصل کیا اور ان سب کا اعتقاد ظنی ہے، حالاں کہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

(۲) ان کے علماء ہمارے سلف وخلف سے ممتاز ہیں کہ ان کا علم تو مفید یقین ہے، اور صحابہ وتابعین کا علم مفید ظن ہے، یہ بھی انتہائی درجہ کی ہٹ دھرمی ہے۔ (دیکھئے تیسیر مصطلح الحدیث: ۶۴-۶۵)

امام شافعیؒ نے اس سلسلہ میں اپنی کتاب ''الرسالۃ'' اور ''الأم'' میں سیر حاصل بحث کی ہے، نیز اور بھی عمدہ طور پر ابن قیمؒ نے اپنی کتاب ''مختصر الصواعق المرسلۃ'' میں اس کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جو خاصی طویل ہے، خلاصہ اس کا یوں ہے۔

(۱) یہ قول مبتدع ہے جو ناشی بلا دلیل ہے۔

(۲) یہ قول سلف امت، صحابہ، تابعین وغیرہ کے علماً وعملاً خلاف ہے۔

(۳) اس قول سے بہت سی وہ احادیثِ صحیحہ -جن کا تعلق عقیدہ سے ہے- کی تردید لازم آتی ہے۔

(۴) یہ قول ان تمام ادلہ قرآن کریم وسنت کے مخالف ہے، جو قائلین حجیت اخبار آحاد نے پیش کئے ہیں۔

(۵) ان کا یہ کہنا کہ اخبار آحاد صرف احکام میں حجت ہے نہ کہ عقائد میں، یہ بغیر مخصّص کے تخصیص ہے۔

(٦) اصولیین کا یہ کہنا کہ اخبار آحاد ظنی ہے، مفید علم وعمل نہیں یہ دعوٰی باطل ہے۔

قاضی ابویعلیٰ (م:۵۸۷ھ) فرماتے ہیں کہ خبر واحد موجبِ علم ہے، جب کہ اس کی سند صحیح ہو اور اس میں رواۃ مختلف نہ ہوں، اور اس کو تلقی بالقبول حاصل ہو۔ (العدۃ:۲/۱۸۷)

اسی طرح ابواسحٰق شیرازیؒ (م:٤٧٦ھ) فرماتے ہیں کہ خبر واحد موجبِ علم وعمل ہے، جب کہ اس کو تلقی بالقبول حاصل ہو۔ (شرح اللمع:۷۵۱)

چھٹا باب

وجوب عمل کے لئے خبر واحد کا قیاس کے موافق ہونا شرط ہے؟
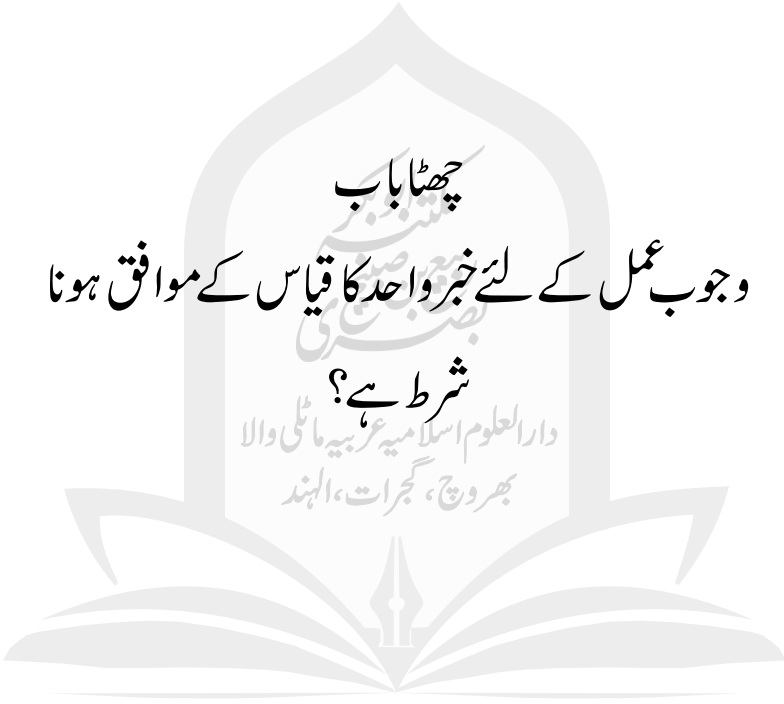
وجوب عمل کے لئے خبر واحد کا قیاس کے موافق ہونا شرط ہے؟

علماء حنفیہ امام صاحبؒ کے اس موقف کے بارے میں مختلف ہیں کہ اخبار آحاد کو قیاس کے مخالف ہونے کی بناء پر رد کر دیا جائے گا؟ یا اخبارِ آحاد کو قبول کیا جائیگا اور قیاس کو چھوڑ دیا جائے گا؟ یا راویٔ فقیہ کی خبر کو قبول کیا جائے اور غیر فقیہ کی خبر کو رد کر دیا جائے؟ یا اس شرط کے ساتھ قبول کر لیا جائے کہ کہیں قیاس کا دروازہ من کل وجہٍ بند نہ ہو جائے؟

واضح رہے کہ خبر واحد جب قیاس کے مخالف ہو تو خبر واحد متروک ہوگی اور قیاس پر عمل کیا جائے گا، لیکن یہ حکم ہر خبر واحد کے بارے میں نہیں ہے؛ بلکہ اس خبر واحد کے متعلق ہے جس کا راوی حفظ وضبط اور عدالت میں تو مشہور ہو؛ لیکن فقہ میں مشہور نہ ہو، جیسے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ، اور اگر خبر واحد کا راوی فقہ میں بھی مشہور ہو اور اس کو اجتہاد کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ سے تقدم حاصل ہو جیسے خلفاء راشدین اور عبادلۂ ثلاثہ وغیرہ، اگر ان حضرات سے خبر واحد مروی ہو تو مقبول ہوگی اور اسکے مقابل قیاس متروک ہوگا۔

راوی کے فقہ میں مشہور نہ ہونے کی صورت میں اگر اس کی خبر واحد قیاس کے موافق ہے، تو اس پر عمل کیا جائے گا اور حتی الامکان یہی کوشش ہوگی کہ دونوں پر عمل ہو جائے، لیکن اگر دونوں میں جمع ممکن نہ ہو، تو مطلقاً خبر کو مقدم کیا جائے گا۔ یہی امام

ابوحنیفہؒ،امام شافعیؒ اورامام احمدکا مذہب ہے۔

غیرفقیہ راوی کی خبرواحد، قیاس کے مخالف ہونے کی وجہ سے اس لئے متروک ہوتی ہے کہ اگرمخالفت قیاس کے باوجود غیرفقیہ کی خبرواحد پرعمل کیا گیا،تو قیاس کا دروازہ من کل وجہٍ بند ہوجائے گا،حالانکہ باری تعالیٰ نے ''**فاعتبروایاأولي الأبصار**'' کے ذریعہ قیاس کا امرفرمایاہے،نیزعام طورپرحدیث بالمعنیٰ نقل کی جاتی ہے نہ کہ باللفظ، پس راوی کے غیرفقہ ہونے کی صورت میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس غیرفقیہ راوی نے حدیث کونقل کرنے میں غلطی کی ہو اور اس نے آپﷺ کی مراد کو نہ سمجھا ہو، اور جب ایسا ہے تو اس کے قول پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہےاوراس کےقول کی وجہ سے قیاس کوکیسےترک کیا جاسکتا ہے۔

غیرفقیہ کی خبرقیاس کے مخالف ہو،اس کی مثال : جیسا کہ ابوہریرہؓ سے مرفوع حدیث مروی ہےجس کوامام أبوداودؒاورترمذیؒ نےنقل کیاہے''**من غسل المیت فلیغتسل ومن حمله فلیتوضأ**''(ابوداودشریف،کتاب الجنائز،رقم:۳۱۶۱)اگرکسی نے میت کوغسل دیا،تووہ خودبھی غسل کرےاورجس نے میت کواٹھایا،وہ وضوءکرے۔اس خبر واحد سے ثابت ہوتاہے کہ میت کوغسل دینے کی وجہ سے غسل دینے والے پرغسل واجب ہوتاہےاور جنازہ اٹھانے کی وجہ سے اٹھانے والے پروضوء واجب ہوتا ہے ،حالانکہ قیاس اس کے خلاف ہے،اس لئے اس مسئلہ میں سب کے نزدیک قیاس پر عمل ضروری ہے،اورحدیث ابوہریرہؓ متروک ہے۔

دوسری مثال: وہ حدیث ہے جو مسئلہ مصراۃ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:

''ان النبي ﷺ قال: لا تصروا الابل والغنم فمن ابتاعها بعد ذلک فهو بخير النظرين بعد ان يحلبها ان رضيها أمسكها وان سخطها ردها وصاعا من تمر ''.(مسلم شریف، باب حکم بیع المصراۃ، رقم:۱۵۲۴) اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اونٹنی اور بکری کے تھنوں میں دودھ جمع نہ کرو، جس نے تصریہ کے بعد خریدا، تو اس جانور کو دوھنے کے بعد مشتری کو اختیار ہوگا، اگر پسند آجائے تو اپنے پاس روک لے، اور اگر پسند نہ آئے، تو اس جانور کو واپس کردے (اور نکالے ہوئے دودھ کے بدلے میں) ایک صاع تمر دیدے۔

یہ حدیث من کل وجہ قیاس کے مخالف ہے؛ کیوں کہ نقصانات میں قیاس یہ ہے کہ اگر وہ شئے ذوات الامثال میں سے ہے، تو ضمان مثل صوری سے واجب ہوتا ہے، اور اگر ذوات القیم میں سے ہے، تو قیمت واجب ہوتی ہے، پس اگر دودھ ذوات الامثال میں سے ہے تو مشتری پر اس دودھ کا ضمان -جس کو اس نے استعمال کرلیا ہے- اس کے مثل دودھ کے ساتھ واجب ہونا چاہئے، یعنی اتنا ہی اس جیسا دودھ واجب ہونا چاہئے، اور اگر دودھ ذوات القیم میں سے ہے، تو اس دودھ کی بازار کے مطابق قیمت واجب ہونی چاہئے، اور یہاں حدیث میں ان دونوں میں سے کسی کو واجب نہیں کیا گیا؛ بلکہ ایک صاع تمر واجب ہے، جو دودھ کا نہ مثل صوری ہے اور نہ ہی مثل معنوی، اس لئے ہمارے اصحاب نے اس خبر کو ترک کردیا ہے۔

نوٹ: یہ بات یاد رہے کہ خبر کو قیاس پر مقدم کرنے کے لئے راوی کے فقیہ ہونے کی شرط احناف میں سے عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور قاضی ابوزید نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور متأخرین میں سے بہت سے علماء نے عیسیٰ بن ابان کے مذہب کی تابعداری کی ہے، البتہ ابوالحسن کرخیؒ اور احناف کے متقدمین فقہاء کے نزدیک خبر کو قیاس پر مقدم کرنے کے لئے راوی کے فقیہ ہونے کی شرط منقول نہیں؛ بلکہ ہر عادل راوی کی خبر (خواہ فقیہ ہو یا غیر فقیہ) قیاس پر مقدم ہوگی، جب کہ وہ کتاب وسنت کے مخالف نہ ہو، لہذا غیر فقیہ راوی کی روایت بھی قیاس پر مقدم ہوگی، اسی وجہ سے عمر فاروقؓ نے حمل بن مالک کی حدیث کو باوجود ان کے غیر فقیہ ہونے کے جنین کے مسئلہ میں قبول فرمائی ہے، حالانکہ حدیث قیاس کے مخالف ہے۔

رہا مسئلہ حدیث مصراۃ کا جس کو عیسیٰ بن ابان نے اپنے مذہب کی تائید میں پیش فرمایا ہے، تو اس کے متعلق یہ جواب دیا گیا ہے کہ اول حضرت ابوہریرہؓ کو غیر فقیہ رواۃ میں شمار کرنا ہی غلط ہے؛ بلکہ وہ فقیہ مجتہد راوی ہیں، صحابہ کے زمانہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے اور صحابہ کے زمانہ میں وہی صحابی فتویٰ دے سکتے تھے، جو فقیہ اور مجتہد ہوں، اب رہ گیا سوال حدیث کے ترک کرنے کا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کو اس وجہ سے ترک نہیں کیا کہ وہ قیاس کے مخالف ہے؛ بلکہ قرآن پاک: ﴿**فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم**﴾ اور ﴿**جزاء سيئة سيئة مثلها**﴾ کے مخالف ہونے کی وجہ سے نیز حدیث مشہور "**الخراج بالضمان**" کے مخالف ہونے کی وجہ سے اس کو ترک

کردیا ہے۔(نورالانوار:۱۸۳حاشیہ۲۲،حسامی:۵۷حاشیہ۳،ظفرالأمانی ۶۵)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ خبر واحد قیاس کے معارض ہوتو اس سلسلہ میں امام صاحبؒ کی کیارائے ہے۔

یہ بات توبالکل واضح ہے کہ بعض متعصب محدثین نے آپ پر بہت سے الزامات عائد کئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ حدیث کے مقابلہ میں قیاس کوترجیح دیتے تھے، یہ الزامات بعیدازانصاف وحق ہے۔

چنانچہ ابن حزم(م:۴۵۶ھ)فرماتے ہیں کہ تمام حنفیہ اس بات پر متفق ہیں کہ امام صاحبؒ کا مذہب یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک قیاس سے اولیٰ ہے۔

اورابن قیمؒ اپنی کتاب ''اعلام الموقعین''میں فرماتے ہیں: کہ اصحاب حنفیہ اس بات پر متفق ہیں کہ امام صاحبؒ کا مذہب یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک رائے وقیاس سے اولیٰ ہے اوراسی پران کے مذہب کی بناء ہے، جیسے انہوں نے ''حدیث قہقہہ'' کواس کے ضعف کے باوجود قیاس پرمقدم کیا۔اسی طرح شوافع کے مشہورعالم شیخ عارف باللہ امام عبدالوہاب شعرانی نے معتدل راہ اختیارکی ہےاور مستقل ایک فصل اس عنوان سے قائم کی کہ امام ابوحنیفہ کی جانب قیاس کوحدیثِ رسول پرمقدم رکھنے کا جوقول منسوب کیا جاتاہے، وہ ضعیف ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ یہ کلام امام صاحب کے متعلق کسی متعصب شخص سے ہی صادر ہوا ہے، جواپنی گفتگومیں غیرمحتاط اوراللہ تعالیٰ کےقول:﴿ان السمع والبصر والفؤاد کل أولئک کان عنه

مسئولا﴾ . (الاسراء:۳٦) **نیز:** ﴿**ما یلفظ من قول الا لدیه رقیب عتید**﴾ .
(ق:۱۸) سے **غافل ہے، نیز حدیث رسول**ﷺ: ''**یا معاذ! هل یکب الناس علی وجوههم في النار الا حصائد ألسنتهم**''.(ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنۃ، رقم:۳۹۷۳) سے لا پرواہ ہے، جب کہ امام ابوجعفر الشیز اماری امام صاحب سے سند متصل سے نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب فرماتے تھے:''**کذب واللہ وافتری علینا من یقول عنا انا نقدم القیاس علی النص، وهل یحتاج بعد النص الی القیاس**''؟(کتاب المیزان:۱/۲۲۴)

ترجمہ: قسم بخدا اس آدمی نے جھوٹ کہا جو یہ کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں، کیا نص کے ہوتے ہوئے قیاس کی ضرورت پڑسکتی ہے؟

جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خبر واحد امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مطلقاً قیاس پر مقدم ہے، چاہے اس میں عمومِ بلویٰ کا وصف ہو، یا نہ ہو، اور چاہے وہ فقہاء صحابہ سے منقول ہو یا کسی اور سے، فقہ حنفی کے مسائل کا منصفانہ انداز میں مطالعہ کرنے والا انسان اس حقیقت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے، **وباللہ التوفیق وهو المستعان**. (دیکھئے: معاییر الحنفیہ فی الاحتجاج بالسنۃ للشیخ خالد سیف اللہ الرحمانی: ۲۵-۲۷)

ساتواں باب

اخبار آحاد کا دیگر ادلۂ شرعیہ سے موازنہ
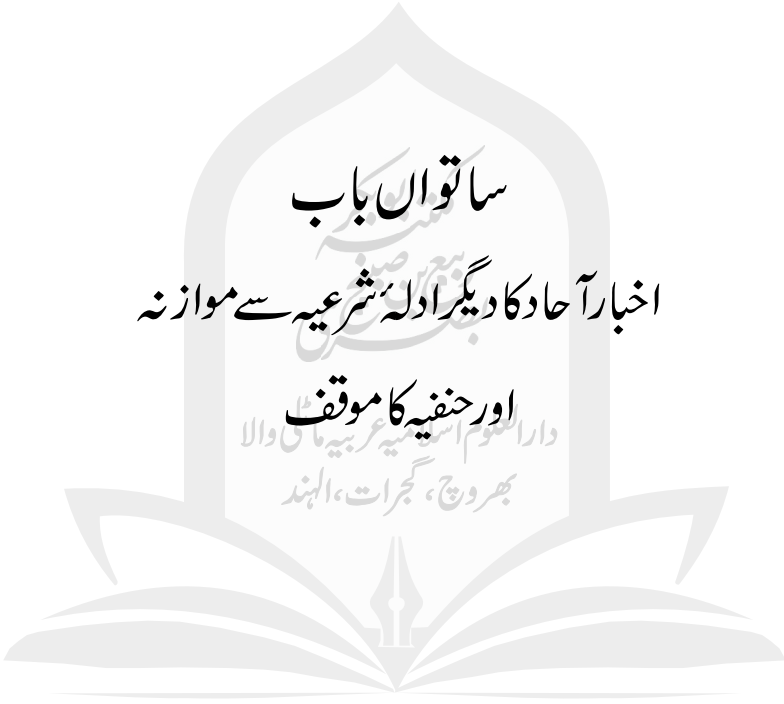
اور حنفیہ کا موقف

اخبار آحاد کا دیگر ادلۂ شرعیہ سے موازنہ اور حنفیہ کا موقف

اگر دو یا دو سے زائد حدیثوں میں بظاہر تعارض ہو، تو اس تعارض کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے دیکھا جائے گا کہ خود رسول اللہ ﷺ سے ان میں سے کسی ایک کے منسوخ ہونے کی صراحت کسی حدیث میں وارد ہے یا نہیں؟ اگر کسی حدیث مرفوع میں نسخ کی صراحت موجود ہو تو یہ نسخ منصوص ہے اور باتفاق علماء مقدم ہے، چناں چہ ناسخ پر عمل کیا جائے گا اور منسوخ کو چھوڑ دیا جائے گا، جیسے: **کنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها** .(مسلم ،کتاب الجنائز ،رقم: ۹۷۷)

اگر نسخ منصوص کا ثبوت نہ ہو؛ بلکہ نسخ اجتہادی کی کوئی شکل سامنے آتی ہو، تو بعض علماء احناف کے نزدیک نسخ اجتہادی کو استعمال کر کے ناسخ پر عمل کیا جائے گا اور منسوخ کو ترک کر دیا جائے گا جیسے "كان آخر الامرين من رسول الله ﷺ ترك الوضوء مما مسة النار" (نسائی : الطهارة، رقم : ۱۸۵)

ورنہ اگر ترجیح ممکن ہو، تو وجوہ ترجیح کی بنیاد پر ایک حدیث کو دوسری پر راجح قرار دیا جائے گا، اور اگر ترجیح نہ ہو، تو ممکن حد تک دونوں میں جمع و تطبیق کی کوشش کی جائے گی۔

یہ ترتیب حنفیہ کے یہاں مشہور و معروف ہے، اور عام طور پر ان کی کتبِ اصول میں اسی طرح لکھا ہوا ملتا ہے؛ لیکن عملی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے جمع و تطبیق کی راہ اپنائی جاتی ہے، پھر نسخ اجتہادی کی، پھر ترجیح کی، اور یہی شوافع کا بھی نقطۂ نظر ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ جب دو حدیثوں میں تعارض ہوتا ہے تو اگر نسخ منصوص کا وجود نہیں ہے تو ترجیح کا عمل اختیار کیا جاتا ہے، اس ترجیحی عمل

کے سلسلہ میں حنفیہ کا موقف انتہائی احتیاط پر مبنی ہے، چنانچہ وہ دیگر ادلۂ شرعیہ سے موازنہ ضروری سمجھتے ہیں جس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

(۱) عرض الحدیث علی القرآن:

اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم کتاب ہدایت ہے اور حدیث نبوی اس کی شرح وتفسیر، یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن کریم اور اس کی شرح یعنی ''حدیث'' آپس میں متعارض ہوں، چنانچہ اگر کسی حدیث کا مفہوم قرآن کے معنیٰ سے معارض ہوتا ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حدیث کی روایت میں کوئی نقص ہے، لہذا قرآن کے مقابلہ میں حدیث رد کردی جائے گی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آقا ﷺ کے حکم کو رد کر دیا گیا؛ بلکہ راوی اس حدیث کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ نہیں پایا اور خطا ونسیان کا شکار ہوگیا، اور چونکہ قرآن کریم اس طرح کے تمام احتمالات سے پاک ہے، اسی وجہ سے صحابہؓ نے متعدد احادیث قرآن کریم سے موازنہ کرتے ہوئے ان کی صحت اور خطا کا فیصلہ کیا ہے۔

عرض الحدیث علیٰ القرآن کی وجہ: امام صاحبؒ نے اس اصل کو اپنی طرف سے نہیں گڑھا؛ بلکہ ان کے زمانہ میں خصوصاً عراق میں اہل بدعت نے احادیث وضع کرنے کا کاروبار شروع کیا، تو امام صاحبؒ نے صحابہؓ وتابعین کے طرز پر چلتے ہوئے اس اصل کی بنیاد رکھی، اور اس اصول پر امام مالکؒ نے بھی بہت سے موقع پر عمل کیا ہے اور اس کی کئی

مثالیں اپنی کتاب ''الاعتصام'' میں پیش کی ہیں، دوسری طرف امام شافعیؒ اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کہ اس اصول پر عمل کرنے سے تمام سنتوں کو رد کرنا لازم آتا ہے، حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ بہت سے احکام شرعیہ کا ثبوت سنت اور بالخصوص اخبار آحاد سے ہے، اس اصل سے بہت سے احکام شرعیہ کا بطلان لازم آتا ہے۔

نظریہ ''عرض الحدیث علی القرآن'' کے دلائل:

(ا) امام صاحبؒ نے اپنی کتاب ''**العالم والمتعلم**'' میں تحریر فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص یہ کہے کہ میں ہر اس بات پر یقین کرتا ہوں، جو نبی ﷺ نے فرمائی؛ مگر نبی ﷺ ظلم کی بات نہیں فرماتے اور قرآن کی مخالفت نہیں فرماتے، تو اس کا یہ کہنا آنحضرت ﷺ اور قرآن کی عین تصدیق ہے اور آپ ﷺ کو قرآن کی مخالفت سے منزہ قرار دینے کے مرادف ہے، کیوں کہ اگر آپ ﷺ قرآن کے خلاف کوئی بات کہیں گے، تو اللہ کی طرف سے ضرور گرفت ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**ولو تقوّل علینا بعض الأقاویل لأخذنا منه بالیمین ثم لقطعنا منه الوتین**﴾. (الحاقۃ:۴۴) (ترجمہ: اور اگر پیغمبر ہمارے ذمہ کچھ جھوٹی باتیں لگا دیتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے، پھر ہم ان کی رگ دل کاٹ دیتے)

چناں چہ ایسی کسی حدیث کا رد کر دینا، جو قرآن کے خلاف ہو، یہ حدیثِ نبوی کے رد کرنے اور آپ ﷺ کو جھٹلانے کے مرادف نہیں؛ بلکہ اس راوی کو جھٹلانا ہے جو آپ ﷺ کی جانب غلط بات منسوب کر رہا ہے، اگر چہ اس کا جھوٹ نادانستہ ہو، باقی وہ صحیح

بات جس کو آپ ﷺ نے واقعتاً فرمایا ہے، خواہ ہم نے اسے سنا ہو یا نہ سنا ہو، وہ ہمارے سر آنکھوں پر، اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک وہ بات سچ ہے، جو آپ ﷺ نے فرمائی۔

اور نبی پاک ﷺ کے متعلق ہم یہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے کسی ایسی بات کا حکم نہیں فرمایا، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہو، نہ ہی آپ نے کسی ایسی چیز کو توڑا، جسے اللہ تعالیٰ نے جوڑا ہو، اور نہ ہی کسی چیز کو اس وصف کے علاوہ سے متصف فرمایا، جس وصف سے اللہ تعالیٰ نے اس کو متصف فرمایا ہے، اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی متابعت کرنے والے تھے، آپ نے اپنی طرف سے کوئی نئی چیز نہیں وضع کی، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی جانب اسے منسوب کیا، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿من يطع الرسول فقد أطاع الله﴾. (جس نے رسول اللہ ﷺ کی بات مانی اس نے اللہ کی بات مانی)۔ (العالم والمتعلم: ۱۰۰-۱۰۳ کمافي توثيق السنة في القرن الثاني الهجري: ۲۸۹)

(۲) امام ابو یوسفؒ ''كتاب الرد علىٰ سير الأوزاعي'' میں فرماتے ہیں: ''فعليک من الحديث بما تعرفه عامة، وإياک والشاذ منه إلخ'' یعنی ایسی حدیث کو لازم پکڑو جس کو عام لوگ پہنچاتے ہوں، اور انوکھی حدیث سے گریز کرو، اس کے بعد امام ابو یوسف نے اپنی سند سے آں حضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا: ''إن الحديث سيفشو عني فما اتاكم عني يوافق القرآن، فهو عني، وما

أتاكم عني يخالف القرآن فليس عني''، یعنی: لوگ میرے حوالے سے حدیث پھیلائینگے ،جس کو تم قرآن کے موافق پاؤں وہ میری حدیث ہے،اور جس کو تم قرآن کے مخالف پاؤں تو وہ میری حدیث نہیں۔ اسی طرح اور بھی کئی حدیثیں روایت فرمائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحت معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا قرآنِ کریم سے موازنہ کیا جائے، اگر حدیث اس کے مخالف ہو تو چھوڑ دی جائے۔ (الرد علی سیر الاوزاعي:۲۵)

واضح رہے کہ اس مضمون کی حدیثیں چند ایک صحابہ مثلاً ابن عمر، ابو ہریرہ، ثوبان اور علی رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں، جن کے مختلف طرق ہیں، اور بعض حدیثیں مرسلاً بھی وارد ہوئی ہیں، اگرچہ ان تمام حدیثوں میں کوئی نہ کوئی متکلم فیہ راوی ضرور ہے، پھر بھی مجموعی اعتبار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان حدیثوں کی کوئی اصل ہے، خاص طور سے جب کہ اس کے موافق علماء کا عمل بھی منقول ہے۔

(۳) امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب اصول فقہ میں اس نظریہ کو نقلی اور عقلی دلیلوں سے مبرہن کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ قرآن یقینی ہے اور خبر واحد کے رسول ﷺ تک پہنچنے میں شبہ ہے،اب اگر قرآن اور حدیث دونوں کو اختیار کیا جائے گا تو دو حال سے خالی نہیں یا تو یقینی کو لیا جائے گا اور مشتبہ کو چھوڑ دیا جائے گا یا پھر مشتبہ کو لیا جائے گا اور یقینی کو چھوڑا جائے گا،اور اس میں شبہ نہیں کہ قرآن نقل متواتر ہونے کی وجہ سے ثبوت میں خبر واحد پر راجح ہے اس لئے حدیث کا قرآن کے مخالف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ

حدیث میں کوئی کمزوری ہے۔

آگے نظریہ ''عرض الحدیث علی القرآن'' اور ''عرض الحدیث علی السنۃ المشہورۃ'' کا فائدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ نقد حدیث کے ان دونوں معیاروں میں بہت کچھ علم پنہاں ہے، ان کے ذریعہ دین کی مکمل حفاظت ہے؛ کیوں کہ بدعات اور باطل افکار نے اس طریقۂ نقد کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے جنم لیا ہے، اسی وجہ سے اہل سنت والجماعت کے علماء نے اس طریقۂ نقد پر عمل کیا، چنانچہ جس حدیث کو قرآن اور سنت مشہورہ کے موافق پایا اس کو قبول کرلیا، اسی طرح جو حکم انہوں نے خبر واحد میں پایا، دراں حالیکہ قرآن وسنت مشہورہ میں اس کا ذکر ہی نہیں ہے اس کو بھی قبول کرلیا، اوراس پر عمل ضروری قرار دیا، اور جس حدیث کو قرآن یا سنت مشہورہ کے خلاف پایا اس کو ترک کردیا۔ (اصول السرخسی، ۱/۲۷۳)

نظریہ ''عرض الحدیث علی القرآن'' اورامام شافعیؒ:

حضرت امام شافعیؒ اس نظریہ کی پورے شد ومد کے ساتھ تردید کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ نظریہ انتہائی خطرناک ہے، اورصرف قرآن کریم پر اعتماد کرتے ہوئے حدیثوں کو نظر انداز کردینے بالفاظِ دیگر انکار حدیث کے باطل نظریہ کو قوت پہنچانا ہے یہی روافض وخوارج کا بھی نظریہ ہے۔

امام شافعیؒ نے ''عرض الحدیث علیٰ القرآن'' کی تردید میں وہ تمام آیات واحادیث پیش کی ہیں، جن سے حدیث کی حجیت ثابت ہوتی ہے اوران نصوص کو بھی

پیش کیا ہے جن میں فتنۂ انکار حدیث سے امت کو آگاہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں وہ مقدام بن معدی کربؓ کی حدیث پیش کرتے ہیں کہ:

''یوشک الرجل متکئاً علی أریکته یحدث بحدیث من حدیثي'' فیقول: بیننا وبینکم کتاب اللّٰه، ما وجدنا فیه من حلال استحللناه، و ماوجدنا فیه من حرام حرمناه، ألا ان ماحرم رسول اللّٰه مثل ما حرم اللّٰه". (ابوداؤد شریف: باب لزوم السنۃ، رقم: ۴۶۰۴، ۴۶۰۵)

ترجمہ: قریب ہے کہ ایک شخص اپنے تخت پر ٹیک لگائے بیٹھا ہوگا، اس کے پاس میری کوئی حدیث بیان کی جائے گی تو وہ کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان صرف کتاب اللہ کا فیصلہ چلے گا، اس میں جو چیز ہم حلال پائیں گے اس کو ہم حلال جانیں گے اور اس میں جو چیز حرام پائیں گے، اسے حرام جانیں گے، سن لو! بیشک اللہ کے رسول ﷺ نے جو کچھ حرام کردیا ہے وہ اسی طرح سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا۔

(۲) امام شافعیؒ اپنی کتاب ''اختلاف الحدیث'' میں لکھتے ہیں: **وان قول من قال: تعرض السنة علی القرآن، فان وافقت ظاهره، والا استعملناه ظاهر القرآن، وترکنا الحدیث جهل.** (اختلاف الحدیث: ۴۴)

ترجمہ: جو لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ حدیث کا قرآن سے موازنہ کیا جائے گا، پس اگر وہ اس کے موافق ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ ہم ظاہر قرآن پر عمل کریں گے، یہ نظریہ جہالت پر مبنی ہے۔

اسی طرح امام شافعیؒ نے ''عرض الحدیث علی القرآن'' پر دلالت کرنے والی احادیث کوذکرکر کے ان کوضعیف اور نا قابل استدلال ثابت فرمایاہے۔

اسی طرح ''کتاب الأم''میں امام ابو یوسفؒ کی باتیں نقل کر کے ان کی تردید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''أما ماذهب اليه من ابطال الحديث وعرضه على القرآن، فلو كان كما ذهب اليه، كان محجوجاً به، وليس يخالف القرآن الحديث، ولكن حديث رسول الله ﷺ مبين معنىٰ ما أراد الله خاصاً وعاماً، وناسخاً ومنسوخاً، ثم يلزم الناس ماسن بفرض الله، فمن قبل عن رسول الله ﷺ فعن الله عزوجل قبل''.

ترجمہ:امام ابو یوسفؒ کا یہ کہنا کہ ''حدیث کا قرآن سے موازنہ کیا جائے گا'' حدیث کورد و باطل کرنے کے مرادف ہے، جب کہ حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہے کیونکہ حدیث اللہ تعالیٰ کی مراد کی وضاحت کرنے والی ہے کہ آیا وہ خاص ہے یا عام، اسی طرح وہ حکم ناسخ ہے یا منسوخ، چنانچہ جو شخص رسول اللہ کی کسی حدیث کوقبول کرتا ہے،تو حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کوقبول کرنے والا ہوتا ہے۔

مزید حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں: اگرابو یوسفؒ کی بات صحیح ہوتو ان کے لئے مسح علی الخفین کرنا،عورت اوراس کی پھوپھی کے درمیان جمع کرنے کی حرمت کا فتویٰ دینا،اوردرندوں کی حرمت کا فتویٰ دینا جائزنہیں ہوگا۔

امام شافعیؒ کی دلیل کا جواب: ہم کہتے ہیں کہ جو حدیث ہمارے سامنے آپ نے پیش کی وہ ہمارے سر آنکھوں پر؛ لیکن اصل بات یہ ہے کہ ''عرض الحدیث علیٰ القرآن'' سے ہماری جو مراد ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ: صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب ہمیں کافی ہے اور بس؛ بلکہ ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن اور سنت متواترہ ومشہورہ ایسے دو حکم شرعی ہیں، جن کے بنیاد ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ،اختلاف صرف ان بعض احکام کے بارے میں ہے جو خبر واحد سے ثابت ہوتے ہیں اور نص قرآن اور سنت مشہورہ سے ثابت احکام کے معارض ہیں، چونکہ قرآن اور سنت مشہورہ کا ثبوت قطعی ہے اور حدیث (خبر واحد) کا ثبوت ظنی ہے ،اس لئے محدثین بعض دفعہ حدیث کی مخالفت کرتے ہیں، جب کہ اس کی صحت اور ثبوت میں ان کو اطمینان نہ ہو یا اس سے قوی تر دلیل کے معارض ہو۔

اور اس طرح کی بات تو خود امام شافعیؒ نے فرمائی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ متعارض احادیث میں - جو اگر چہ صحت وثبوت کو پہنچی ہوئی ہوں - اگر کوئی فقیہ کسی ایک حدیث کے مطابق فیصلہ کرلے، جس کو مختلف قرائن سے دوسری حدیث پر قوت حاصل ہو، تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے حدیث کی مخالفت کی ہے۔ (الرسالۃ:۴۵۸)

رہی بات امام شافعیؒ کی تردید کی تو یہ بھی حفاظت دین اور صیانت دین کے خالص جذبے سے ہے، چونکہ ان کا مقصود بھی صرف یہی ہے کہ کہیں اہل بدعت کو موقع نہ مل جائے اور وہ تمام سنتوں کی تردید کرنے لگیں ،اور امام صاحب کا مقصود بھی صیانت

دین ہی ہے، لہذا کسی نہ کسی حد تک یہ نظریہ فریقین کے درمیان مسلّم ہی ہے۔

خبر واحد اگر نص کتاب یا سنت متواترہ یا اجماع کے خلاف ہے، تو خبر واحد قبول نہیں کی جائے گی، اس لئے کہ یہ ادلۂ قطعیہ ہیں اور خبر واحد ظنی ہے اور قطعی کے ہوتے ہوئے ظنی کالعدم ہے، اور اگر خبر واحد عموم کتاب یا ظاہر کتاب کے مخالف ہو، تو وہ محل اختلاف ہے، ہمارے نزدیک خبر واحد کے ذریعہ عموم کی تخصیص، ظاہر کو ترک کرنا اور اس کو مجاز پر محمول کرنا یہ جائز نہیں اور شوافع اور اکثر اصولین کے نزدیک عموم کی تخصیص خبر واحد کے ذریعے جائز ہے۔ (کشف الاسرار:۳/۱۹-۲۰)

یہاں چار اہم مباحث ہیں:۔

(۱) تخصیص عموم القرآن بالحدیث۔ (قرآن کریم کے عموم کو حدیث کے ذریعہ خاص کرنا)

(۲) تقیید مطلق القرآن بالحدیث۔ (قرآن کریم کے مطلق کو حدیث کے ذریعہ مقید کرنا)

(۳) الزیادۃ علیٰ نص القرآن بالحدیث۔ (نص قرآن پر حدیث کے ذریعہ زیادتی کرنا)

(۴) مخالفۃ خبر الواحد للکتاب۔ (خبر واحد کا کتاب اللہ کے مخالف ہونا)

تخصیص عموم القرآن بالحدیث:

حنفیہ فرماتے ہیں کہ: عموم کی دلالت اس کے افراد پر قطعی ہوتی ہے؛ لہذا ان کے

نزدیک خبر واحد سے اس کی تخصیص جائز نہیں ہے؛ چوں کہ خبر واحد ظنی ہے اور تخصیص کے لئے ضروری ہے کہ مخصِّص مخصَّص سے قوت میں برابر ہو یا بڑھا ہوا ہو اور یہاں خبر واحد ظنی ہے اور عموم قرآن قطعی ہے؛ لہٰذا تخصیص عموم القرآن بالحدیث جائز نہیں۔

علامہ عبدالعزیز بخاری فرماتے ہیں کہ: عموم کتاب، اور سنت متواترہ کی تخصیص خبر واحد اور قیاس سے جائز نہیں ہے، اس لئے کہ دونوں ظنی ہیں اور عموم قرآن قطعی ہے، اور یہی مذہب ہمارا ہے، اور یہی ابوبکر الجصاص، عیسیٰ بن ابان، اور بعض اصحاب شافعی سے منقول ہے اور نیز ابوبکر، عمر، عبداللہ بن عباس اور عائشہؓ کا بھی یہی قول ہے۔ (کشف الأسرار ۱/۵۹۳-۵۹۵)

تنبیہ: عام یہ اپنے افراد پر قطعی الدلالت ہے، یہ اس وقت ہے جبکہ اس کے بعض افراد کی تخصیص نہ کی گئی ہو، لیکن اگر دلیل قطعی کے ذریعہ اس کے بعض افراد کی تخصیص کی گئی ہے تو اس کی دلالت اب اپنے افراد پر ظنی ہوگی، اور اس وقت اس کی تخصیص، خبر واحد اور قیاس سے جائز ہے، اسی طرح عام جب مخصوص منہ البعض نہ ہو تو اس وقت اس کی تخصیص خبر متواتر اور مشہور کے ذریعہ بغیر اختلاف کے جائز ہے اور یہ احناف اور شوافع کی متفقہ رائے ہے یہی علامہ سرخسیؒ اور فخر الاسلام بزدویؒ بھی فرماتے ہیں۔ (اصول سرخسی، ۱/۹۷، اصول بزدوی: ۶۳)

مثال: ارشاد ربانی ہے: **ولا تأكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه وانه لفسق.** (الأنعام: ۱۲۱)

اس آیت میں عموم ہے ہر ذبیحہ کو شامل ہے چاہے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو

یا نہ لیا گیا ہو، چاہے نام عمداً نہ لیا ہو یا نسیاناً۔

علامہ عبد العزیز بخاریؒ (م: ۷۳۰ھ) اس آیت کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں: نہی مطلق تحریم کی مقتضی ہے اس لئے کہ ''مــن'' موضع نفی میں مبالغہ کے لئے ہوتا ہے چنانچہ ذبیحہ کا ہر ہر جزء حرام ہوگا اور نیز ''انـه لفسق'' میں ''ہٗ'' ضمیر کا مرجع اگر اُکل ہے تو اُکل حرام فسق ہے اور اگر مراد مذبوح ہے تو وہ بھی حرام۔ (کشف الأسرار، ۱/۵۶۹)

یہی وجہ ہے کہ احناف نے عموم قرآن کی حدیث براء وابو ہریرہؓ سے تخصیص نہیں کی۔

عـن البـراءؓ أن النبيﷺ قال: المسلم يذبح علىٰ اسم الله، سمّى أو لـم يسـمّ. (اتحاف السادة المتقین: ۶۷) یعنی مسلمان اللہ کے نام پر ہی ذبح کرتا ہے چاہے وہ اللہ کا نام لے یا نہ لے۔

عن أبي هريرةؓ قـال: سـأل رجـل النبيﷺ فقال: يارسول الله! أرأيـت الرجل يذبح وينسىٰ أن يسمّىٰ؟ فقال رسول اللهﷺ: اسم الله علـىٰ فـم مسلم. (المعجم الأوسط، طبرانی، برقم: ۴۷۶۹) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریمﷺ سے سوال کیا اس نے کہاں اے اللہ کے رسول! آپ کا کیا خیال ہے اس آدمی کے بارے میں جو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا بھول جائے؟ آپﷺ نے فرمایا: اللہ کا نام ہر مسلمان کی زبان پر ہوتا ہے۔

نیز حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے: **عـن عـائشةؓ قـالت: قـالوا: يـارسول**

الله ﷺ ان هذا أقواماً حديث عهدهم بشرك يأتوننا بلحمان، لاندري يذكرون الله عليه أم لا؟ قال: أذكروا أنتم اسم الله وكلوا .(بخاری شریف، کتاب الذبائح والصید، باب ذبیحۃ الأعراب ونحوہم، برقم: ۵۵۰۷) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہے: صحابہ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! چند وہ لوگ جن کے شرک کا زمانہ ابھی قریب قریب میں گزرا ہے وہ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے اس پر اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں لیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ کا نام لے کر کھالو۔

حنفیہ نے ان احادیث کے ذریعہ عموم قرآن کی تخصیص نہیں کی چونکہ اخبار آحاد ظنی ہیں اس سے قطعی کی تخصیص جائز نہیں، اس مسئلہ میں امام مالکؒ، امام احمدؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ نے حنفیہ کی موافقت کی ہے۔ (المغنی، ابن قدامہ، ۱۱/۳۲-۳۳)

تقیید مطلق القرآن بالحدیث:

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مطلق اپنے اطلاق پر علی حالہ اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کہ اس کی کسی نص سے تقیید نہ کی گئی ہو، اور مقید اپنی تقیید پر اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کہ کسی نص سے اس کے تقیید کو ختم نہ کیا گیا ہو؛ لیکن اگر کوئی نص ایسی ہے جو ایک جگہ میں مطلق ہے اور دوسری جگہ مقید، تو کیا ان میں سے ایک پر عمل کیا جائے گا یا مطلق کو مقید کیا جائے گا، اس میں کچھ تفصیل ہے جسکو صاحب ''کشف الأسرار'' نے بیان کیا ہے۔ (کشف الأسرار: ۲/۵۲۱)

البتہ اس سلسلہ میں ایک قاعدہ ہے، کہ ہر وہ دلیل جس سے عموم کی تخصیص جائز ہے اس سے مطلق کی تقیید جائز ہے، چنانچہ کتاب اللہ کی کتاب اللہ کے ذریعہ اور سنت کی سنت کے اوران میں سے ہر ایک کی ایک دوسرے کے ذریعہ جائز ہے۔(اللباب فی أصول الفقہ :ص/۱۵۱)

حنفیہ کے نزدیک شرط یہ ہے کہ مقید قوت میں مطلق کے برابر ہو یا اس سے بڑھا ہوا ہو، چنانچہ قرآن کریم کے مطلق کو خبر واحد کے ذریعہ مقید نہیں کیا جائے گا؛ اس لئے کہ قرآن کریم قطعی ہے اور خبر واحد ظنی۔

صاحب اصول الشاشی فرماتے ہیں: کہ ہمارے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ قرآن کریم کے مطلق پر جب تک عمل کرنا ممکن ہو، اس پر عمل کیا جائے، اس پر خبر واحد اور قیاس سے زیادتی کرنا جائز نہیں ہے؛ لیکن خبر پر اس وقت عمل کیا جائے، جب کہ اس پر عمل کرنے سے کتاب اللہ کے حکم میں کوئی تغیر لازم نہ آجئے۔(أصول الشاشی:۴)

شوافع کتاب اللہ کے مطلق کی تقیید کو خبر واحد وقیاس سے جائز قرار دیتے ہیں، اور کتاب اللہ کے مطلق کو تقیید کا بیان قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ مطلق بیان کے ذریعہ تقیید کا احتمال رکھتا ہے، لیکن ہم کہتے ہیں: کہ بیان سابقہ اجمال کا مقتضی ہوتا ہے اور چونکہ مطلق پر عمل ممکن ہے اس وجہ سے مطلق میں کوئی اجمال باقی نہیں رہتا۔(عمدۃ الحواشی علی اصول الشاشی:ص/۱۰)

الزیادة علیٰ نص القرآن بالحدیث:

صاحب اصول بزدویؒ نسخ کے اقسام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۴)نسخ وصفه في الحكم مثل الزيادة على النص.

(۱)اگر زیادتی نص میں عبادت مستقلہ کے قبیل سے ہے، تو تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ زیادتی حکم مزید علیہ کے لئے نسخ ثابت نہیں ہوگی، اس لئے کہ شرع میں کسی حکم کی زیادتی اول میں تغیر وتبدل کے بغیر ہوتی ہے۔

(۲)اگر زیادتی نص میں شرط یا جزء کے قبیل سے ہے اور یہ زیادتی حکم مزید علیہ کے بعد وارد ہوئی ہو تب اس میں اختلاف ہے کہ اس درمیانی مدت میں اس پر نسخ کا حکم لگانا درست ہے یا نہیں؟ چنانچہ جمہور کے نزدیک یہ زیادتی تخصیص اور بیان سمجھی جائے گی، اور حنفیہ کے نزدیک معنًی نسخ اور صورتاً بیان سمجھی جائے گی، چنانچہ جمہور نص قرآنی میں خبر واحد اور قیاس سے زیادتی جائز قرار دیتے ہیں، اور حنفیہ نص سے ثابت شدہ حکم کے نسخ کو خبر واحد اور قیاس سے جائز قرار نہیں دیتے ہیں۔ (کشف الأسرار،۳/۳۶۱، اللباب فی اصول الفقہ:۱۹۴)

ہر ایک کے دلائل کتب فقہ واصول میں موجود ہیں۔

خلاصۂ کلام: حنفیہ کہتے ہیں: کہ اگر نص قطعی ہے، تو اس میں زیادتی نسخ کے قبیل سے ہے، چنانچہ نص قرآنی میں خبر واحد اور قیاس سے زیادتی ان کے نزدیک جائز نہیں

ہے، اس لئے کہ قطعی کا نسخ ظنی کے ذریعہ جائز نہیں ہے۔

رہی بات ان لوگوں کی جو یہ کہتے ہیں کہ زیادتی تخصیص و بیان کی قبیل سے ہے، ان کے نزدیک نص قرآنی میں خبر واحد اور قیاس سے زیادتی جائز ہے۔

مثال: چوں کہ نص میں زیادتی حنفیہ کے نزدیک نسخ ہے اور خبر واحد کے ذریعہ کتاب اللہ کا نسخ جائز نہیں، اسی وجہ سے ہمارے علماء نے نماز میں قراءت فاتحہ کو فرض و رکن قرار نہیں دیا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "**فاقرؤا ماتیسر من القرآن**" (المزمل:۲۰) اس آیت کریمہ میں عموم ہے جو اس بات کی مقتضی ہے کہ بغیر فاتحہ کے بھی نماز صحیح ہو، اور دوسری طرف آپ ﷺ کا فرمان ہے "**لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب**" (حلیۃ الأولیاء، ۷/۱۲۴) اب اگر ہم قراءت کو فاتحہ سے مقید کر دیں تو یہ اس مطلق پر نسخ ہے اور یہ خبر واحد کے ذریعہ جائز نہیں ہے، چنانچہ حنفیہ نے کتاب و خبر واحد دونوں کو اپنے اپنے مقام پر رکھتے ہوئے کہا کہ جو چیز نص قرآنی سے ثابت ہے، وہ فرض ہے، اور جو خبر واحد سے ثابت ہے، وہ واجب ہے، اور اسی حقیقت کی طرف صاحب اصول الشاشی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ (اصول الشاشی: ۷، اصول سرخسی: ۱/۹۹، کشف الأسرار ۳/۳۶۸)

مخالفۃ خبر الواحد للکتاب:

خبر واحد اگر کتاب اللہ کے مخالف ہو، تو وہ نہ مقبول ہوگی اور نہ حجت۔

مثال: حدیث "**من مسّ ذکرہ فلیتوضأ**" (ترمذی، کتاب الطہارت، باب الوضوء من مس

الذکر، رقم:۸۲)

علماء احناف اس حدیث کو چند وجوہ کی بناء پر قبول نہیں کرتے: (۱) خبر کا کتاب اللہ کے مخالف ہونا، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿فیہ رجال یحبون ان یتطھروا﴾ (التوبۃ:۱۰۸) اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں استنجاء بالماء سے طہارت حاصل کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہیں، اوران کے اس فعل کو تطہر سے تعبیر کیا ہے، اور بات بالکل واضح ہے کہ استنجاء بالماء مس ذکر کے بغیر ممکن نہیں، اگر مس ذکر کو حدث قرار دیا جائے، تو استنجاء کا تطہر ہونا ثابت نہیں ہوگا، حالانکہ خود قرآن کریم نے استنجاء بالماء کو تطہر کہا ہے، چنانچہ حدیث میں مس ذکر کو بول کے قائم مقام کرتے ہوئے حدث قرار دینا کتاب اللہ کے خلاف ہے۔ (کشف الأسرار،۲/۲۴۷،۳/۲۴-۲۵، أصول سرخسی:۱/۲۷۳)

(۲) عرض الحدیث علی السنۃ المشھورۃ:

اس اصل کا مطلب یہ ہے کہ آں حضرتﷺ کی سنت بطریق تواتر یا بطریق شہرت لوگوں میں رائج ہے اور لوگوں کا اس کے مطابق عمل ہے، یہ حدیث اگر اس سنت مشہورہ کے خلاف ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو یہ اس خبر کی خاص شخص یا وقت یا حال کے اعتبار سے کوئی استثنائی صورت تھی جیسے حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کی شہادت کو دو کے قائم مقام کرنا، یا جیسے آقاﷺ کا فرمان ہے "القضاء بشاھد ویمین" ایک یمین وشاہد کی بنیاد پر فیصلہ کرنا وغیرہ، حالانکہ یہ مخالف ہے سنت مشہورہ کے اور آپﷺ کے

اس فرمان کے:''البینةعلی المدعي،و الیمین علی من أنکر''. یہ مخالفت دووجہ سے ہے۔

(ا) شریعت نے کل ایمان منکر کا حق قرار دیا ہے نہ کہ مدعی کا، اس لئے کہ لام استغراق جنس کا مقتضی ہے، چنانچہ جس نے یمین مدعی کا حق قرار دیا، اس نے نص کی مخالفت کی اور اس نے اس کے مقتضاء یعنی استغراق پر عمل نہیں کیا۔

(۲) شریعت نے خصوم کی دو قسمیں کی ہیں: (ا) مدعی (۲) منکر، اور حجت کی بھی دو قسمیں بیان کی ہے (ا) بینہ (۲) یمین، اور جنس یمین کو منکر کا حق قرار دیا ہے اور جنس بینہ کو مدعی کا حق قرار دیا اور یہ قطع شرکت کی مقتضی ہے اور اس بات کی مقتضی ہے کہ ایک ہی جانب بینہ و یمین جمع نہ ہو، اور ایک شاہد و یمین کی خبر پر عمل کرنے سے اس خبر مشہور کے موجب پر ترک عمل لازم آتا ہے چنانچہ اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ (کشف الاسرار، ۳۰/۳) یہی علامہ ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں۔ (اعلاء السنن، ۱۵/۳۵۱)

اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ سے ''بیـــع الرطب بـالتمر'' کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:''أینقص اذا جفّ''؟ کہ کیا جب وہ خشک ہو جاتی ہے تو کم ہو جاتی ہے، صحابہؓ نے کہا کہ جی ہاں! تو آپ ﷺ نے منع فرمایا، یہ مخالف ہے سنت مشہورہ کے جو آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''التمـر بـالتمـر مثلاً بمثل''، اسی وجہ سے امام صاحبؒ نے ''بیع الرطب

بالتمر"والی خبر پر عمل نہیں کیا۔

(۳)عرض الحدیث علی الاجماع:

اگر کوئی حدیث ایسی وارد ہو، جس کے خلاف امت کا اجماع ہو گیا ہو، تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حدیث یا تو منسوخ ہے یا کسی علت کے ذریعہ معلول ہے، چنانچہ حکم شرعی کی بناء اس پر نہیں رکھی جاسکتی، مثلاً وہ حدیث جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ چور اگر چوتھی مرتبہ چوری کرے، تو اسے قتل کر دو۔ (سنن کبریٰ: بیہقی رقم: ۱۷۷۴۹)

(۴)عرض الحدیث علی القواعد الکلیۃ الثابتۃ فی الشرع:

اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہاء کرام کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور عمل صحابہ میں وارد مختلف احکام سے متعلق ہدایات میں غور کر کے ایک قدر مشترک اصول مستنبط کرتے ہیں، جو مجمع علیہ ہوا کرتا ہے، جب خبر واحد ان اصولوں کے مخالف ہو، تو وہ دو دلیلوں میں سے جو زیادہ قوی دلیل ہو اس کو مد نظر رکھتے ہوئے اصل پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور جو خبر اس کے مخالف ہو اس کو شاذ شمار کرتے ہے۔

جیسا کہ علامہ زیلعی "نصب الرایۃ" میں فرماتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک اخبار کے قبول کرنے کی شرطوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ خبر چاہے مسند ہو یا مرسل، جن اصولوں پر اجماع ہو چکا ہے ان سے تجاوز نہ کیا جائے،

علامہ زیلعی مزید فرماتے ہیں: علماء نے ان اصولوں کو جمع کرنے میں بڑی محنت

کی، یہاں تک کہ ان کے پاس چند اصول جمع ہوگئے، وہ ان اصولوں پر اخبارِ آحاد کو پیش کرتے ہیں، اگر وہ اخبارِ آحاد ان اصولوں کے موافق نہ ہوں، تو وہ لوگ قوی دلیل کے مقابلہ میں اس کو کمزور سمجھتے ہیں اور یہی اصل اصول ہے۔ (نصب الرایۃ: ۱/۱۴)

یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ اصول وقواعد کلیہ سب کے سب کتاب وسنت سے ہی مأخوذ ہیں۔

مثلاً ایک قاعدہ ہے: ''**الخراج بالضمان**'' (کہ فائدہ بعوض ذمہ داری حاصل ہوتا ہے) یہ قاعدہ تمام ائمہ کے نزدیک مسلم ہے، چنانچہ اس قاعدہ پر عمل کرتے ہوئے حنفیہ نے ''**حدیث مصرّاۃ**'' کو قابل عمل نہیں سمجھا۔

حدیث مصرّاۃ: **وهو ما روي عن النبي ﷺ قال: ''لا تصروا الابل والغنم، فمن ابتاعها بعد فانه بخير النظرين بعدأن يحلبها، ان شاء أمسک، وان شاء ردها وصاع تمر'' وفي رواية: ''صاعاً من طعام وهو بالخيار ثلاثاً.''** (بخاری شریف: رقم: ۲۱۴۸، باب النھی للبائع أن لا یحفل الابل والبقر والغنم)

مصرّاۃ: بکری وغیرہ کے تھن میں دو ایک وقت کا دودھ باقی رکھ کر مشتری کے سامنے دوہا جائے تاکہ وہ اسے زیادہ دودھاری سمجھ کر معاملہ کرے، صحیح سندوں سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے مصرّاۃ بکری خریدی پھر خلاف واقعہ ظاہر ہونے کی صورت میں اگر لوٹانی پڑی، تو بکری کے ساتھ ایک صاع کھجور بھی بائع کو واپس کرے، یہ کھجور اس دودھ کے عوض میں ہوگا، جو مشتری نے بکری سے دوہا ہے۔

یہ حدیث مذکورہ قاعدہ کلیہ کے منافی ہے، کیونکہ جب بکری خریدار کے ضمان میں آ گئی، تو اس سے حاصل ہونے والے فوائد کا استعمال بھی اس کا حق ہوگیا، لہذا واپسی کے وقت حاصل شدہ دودھ کا عوض ایک صاع کھجور کی شکل میں واپس کرنے کا لزوم نامناسب ہے، اس وجہ سے حنفیہ نے اس حدیث کو تشریع کی بنیاد نہیں بنایا، اور کسی علت سے معلول قرار دے کر اس کی مناسب تاویل کی ہے۔

(۵) عرض خبر الواحد علی ماتعم بہ البلوی:

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حدیث کسی ایسے مضمون سے متعلق ہو جس کے شہرت و استفاضہ کے ساتھ لوگوں میں پھیلنے کے اسباب موجود ہوں، اور اس کے جاننے کی بھی سبھی کو حاجت ہو، پھر بھی اسے کوئی ایک شخص ہی روایت کرے، تو یہ بات شبہ پیدا کرتی ہے اور اس بات کی مقتضی ہے کہ اسے حکم عام کا درجہ نہ دیا جائے۔

مثلاً حدیث بسرہ بنت صفوانؓ، جو مسّ ذکر سے وضو ٹوٹ جانے کے متعلق ہے، اس کو مرد صحابہ میں سے کوئی بھی روایت نہیں کرتے، جب کہ اس کا علم تمام مردوں کو ہونا چاہئے تھا، لہذا اس اصول کی بناء پر ترک کر دی گئی۔

صاحب کشف الأسرار فرماتے ہیں کہ جب خبر واحد ایسے امر کے سلسلے میں وارد ہو جس میں ابتلاء عام ہو، اور وہ عمل کو واجب کرنے والی ہو، تو ہمارے اصحاب میں سے شیخ ابوالحسن الکرخی کے نزدیک قبول نہیں کی جائے گی اور یہی متأخرین کا مذہب ہے۔ (کشف الأسرار ۳/۳۵)

امام شافعی اور اکثر اصحاب حدیث اور بعض حنفیہ نے اس اصل کا انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب خبر واحد کی سند صحیح ہے، تو قبول کر لی جائے گی، اگرچہ اس کا تعلق عموم بلویٰ سے ہو؛ اس لئے کہ انہوں نے عموم بلویٰ کے ہوتے ہوئے خبر واحد پر عمل کیا، اس سلسلہ میں انہوں نے استدلال کیا عمل صحابہ سے مثلاً: ابن عمرؓ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: ''**كنا نخابر أربعين سنةً حتىٰ روىٰ لنا رافع بن خديجؓ أن النبي ﷺ نهىٰ عن المخابرة فانتهينا**''. (مسلم شریف: کتاب البیوع، باب کراء الارض، رقم: ۱۵۴۷)

اس سلسلہ میں انہوں نے عمل صحابہؓ سے استدلال کیا ہے تو صحابہؓ نے ان حوادث میں جو خبر واحد پر عمل کیا، تو وہ چند ایسے قرائن کی بناء پر تھا، جو ان کے ساتھ مخصوص تھے، یا وہ ان تک اس حالت میں پہنچی کہ وہ مشہور ہو چکی تھی۔

رہی بات کہ خبر واحد صدق ظن کا فائدہ دیتی ہے تو یہ ہمیں تسلیم نہیں اس لئے کہ عدم شہرت صدق ظن کے معارض ہے اور معارض کے ہوتے ہوئے ظن حاصل نہیں ہوتا برخلاف قیاس کے کہ وہ اس کے معارض نہیں۔

فائدہ: حنفیہ نے اس اصل کو نقد اخبار آحاد اور مزید تثبت واحتیاط کی بناء پر اختیار کیا، اور وہ محض کسی خبر کو اس بناء پر رد نہیں کر دیتے اس کا تعلق عموم بلوی سے ہے، بلکہ جب کبھی وہ کیسی ایسی خبر کو رد کرتے ہیں جس کا تعلق عموم بلوی سے ہو تو ان کے پاس اور بھی بہت سے دلائل ہوتے ہیں جو اس خبر پر عمل سے مانع ہوتے ہیں۔

چنانچہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حنفیہ اخبار آحاد کو رد کر دیتے ہیں محض اس وجہ

سے کہ اس میں عموم بلویٰ ہے، ان کا یہ قول قلتِ اطلاع پر مبنی ہے یا عناد و سرکشی پر۔

(۵) عرض الحدیث علی العمل المتوارث فی الأمۃ:

حنفیہ کے سمیت اکثر ائمہ کرام کے نزدیک عمل متوارث کی اہمیت بہت زیادہ ہے، چنانچہ امام مالکؒ حدیثوں کو عمل اہل مدینہ کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، اور جس حدیث کے مطابق ان کا عمل نہیں پاتے، اس کو قابل عمل نہیں سمجھتے، اسی طرح صحابہ کرام مختلف بلاد اسلامیہ میں پھیلے اور وہاں اشاعت اسلام اور سنت نبوی کی خدمت میں مصروف رہے جن کی وہاں کے لوگوں نے اقتداء کی، پس ان کے درمیان صحابہ کرام کے ذریعہ جو عمل عمومی طور پر نقل در نقل ہوتا ہوا آیا ہے ظاہر ہے وہ کسی مضبوط اصل پر مبنی ہے، اسی لئے اس کا احترام لازمی ہوگا۔

عمل متوارث کی حیثیت: سلف میں نقد حدیث کی اصل کسوٹی عمل متوارث ہی تھا، چنانچہ دوسری صدی کے اختتام تک اہل علم عمومی طور پر اخبار آحاد کو سلف کے معمول پر پرکھ کر اس کی صحت و سقم کا فیصلہ کیا کرتے تھے، حضرت مولانا عبدالرشید نعمانیؒ نے اس موضوع پر ایک جامع مضمون رقم فرمایا ہے، جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

اُس وقت (دوسری صدی کے ختم اور تیسری کے اوائل تک) مصنفین عام طور پر اپنی کتابوں میں ان ہی روایات کو جگہ دیتے تھے، جو اہل علم میں متداول چلی آتی تھیں، اس کا بھی اہتمام تھا کہ حدیث نبوی کے ساتھ صحابہ و تابعین کے اقوال بھی درج کئے جائیں، لیکن اس دور (تیسری صدی) میں یہ انداز بدل گیا، اب ارباب روایت نے ہر

نادر نوشتے اور غیر متداول صحیفے کا کھوج لگا لیا تھا، حجاز، عراق، شام، اور مصر جملہ بلاد اسلامیہ کے افراد وغرائب، خاص خاص خاندانوں کی تحریری یادداشتیں، جن کی روایت کسی خاندان میں محدود و منحصر تھی، اسی طرح کسی غیر مشہور صحابی کی کوئی روایت جس کو ان سے صرف ایک آدھ شخص روایت کرتا چلا آتا تھا، غرض تمام منتشر اور غیر متداول روایات اس عہد میں ہر طرف سے جمع کر لی گئی تھیں، طرق واسانید کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بعض وقت تلاش وتتبع سے ایک ایک روایت کی سو سو بلکہ اس سے بھی زیادہ اسنادیں مل جاتی تھیں، اس طرح تمام اقالیم کا علم روایت، جو اب تک خاص خاص سینوں یا سفینوں میں منتشر اور پراگندہ تھا، اس صدی میں محدثین کی کوششوں سے یکجا ہو گیا تھا۔

ان غرائب وافراد اور نوادر آثار کے جمع ہو جانے پر بہت سی ایسی روایات سامنے آئیں کہ جن پر صحابہ وتابعین اور سلف مجتہدین کا عمل نہ تھا، محدثین کی ایک جماعت - جو درایت سے زیادہ روایت پر زور دیتی تھی - ان روایت کی صحت پر مصر تھی، ان کا خیال تھا کہ صحیح سند سے ایک چیز کے ثابت ہو جانے کے بعد اس پر عمل کرنے میں چوں وچرا کرنا دیدہ ودانستہ حدیث کی مخالفت کرنا ہے۔ ادھر عام اہل فتویٰ ایسی روایات کو سلف کے عدم تعامل وعدم توارث کی بناء پر شاذ اور متروک العمل سمجھتے تھے، ارباب روایت کا بڑا زور اس بات پر تھا کہ علمائے صحابہ وتابعین ہمیشہ مسئلہ کے متعلق حدیث نبوی کی تلاش کرتے رہے ہیں، ہاں حدیث نہ ملتی تو مجبوراً دوسرے استدلالات سے کام لیتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ ان کا یہ دستور رہا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں آئندہ چل کر

انہیں کوئی حدیث مل جاتی تو وہ اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر اس پر عمل پیرا ہو جاتے تھے، لہذا صحابہ وتابعین کا کسی حدیث پر عمل نہ کرنا اس کی علت قادحہ نہیں بن سکتا، اس نظریہ کی وجہ سے محدثین اور ارباب روایت کے ایک گروہ نے ایسی تمام روایت کو معمول بہ قرار دیا اور ان مسائل میں سلف مجتہدین سے بالکل الگ رائے قائم کی، اور صحابہ وتابعین کے جو فتاویٰ ان روایات کے خلاف ملے انہیں تسلیم نہ کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ ''هم رجال ونحن رجال '' (وہ بھی مرد تھے اور ہم بھی مرد ہیں) یعنی جس طرح انہیں اجتہاد کا حق تھا ہمیں بھی ہے۔

مثلاً قلتین کی حدیث اگلے طبقہ میں شائع نہ تھی، اس دور میں اس کی اشاعت ہوئی اور بعض ارباب روایت نے اپنے مذہب کی بناء اسی پر رکھی، لیکن جن علماء کے سامنے سلف کا تعامل تھا انہوں نے اس کو شاذ اور متروک العمل قرار دیا۔

اسی طرح سے ''آمین بالجہر'' کی حدیث بھی ہے، چنانچہ محدث دارقطنی اس کو اپنی سنن میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''**قال أبو بكر :هذه سنةتفرد بها أهل الكوفة** '' (ابوبکر عبداللہ بن ابی داود سجستانی کا بیان ہے کہ یہ وہ سنت ہے جس کی روایت صرف اہل کوفہ نے کی ہے)۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ خود علماء اہل کوفہ میں سے کسی کا اس روایت پر عمل بھی نہیں ہے۔

اسی طرح ''خیار شرط'' کی حدیث (**البيعان بالخيار ما لم يتفرقا**) کہ نہ اس پر فقہائے سبعہ نے عمل کیا ہے، اور نہ فقہائے کوفہ نے اور حدیث ''مصراة'' کہ نہ

اس پرامام اعظم کا عمل ہے، نہ امام مالک کا اور دوسری وہ تمام روایات کہ جن پر عہد صحابہ وتابعین میں ائمۂ فتاویٰ کا عمل نہ تھا۔

ان سب روایات کے بارے میں فقہاء اورارباب روایات کا نقطۂ نظر بالکل جداجدا تھا،فقہاء ان تمام روایات کوتعامل وتوارث سلف کی روشنی میں جانچتے تھے اور ارباب روایت صرف صحت سند پر مدار رکھتے تھے،شاہ ولی اللہ صاحب ''اِزالة الخفاء'' (۸۵/۲) میں لکھتے ہیں:''اتفاق سلف وتوارث ایشاں اصل عظیم است درفقہ'' اور''الانصاف''میں ارباب روایت کا طرزعمل یہ بتلاتے ہیں:''فاذا لم يجدوا في كتاب الله أخذوا بسنة رسول الله ﷺ سواء كان مستفيضاً دائراً بين الفقهاء، أويكون مختصاً بأهل بلد، أو باهل بيت، أوبطريق خاصة، سواء وعمل به الصحابة والفقهاء أولم يعلموا به، ومتیٰ كان في المسألة حديث، فلايتبع فيها خلا ف أثر من الآثار ولااجتهاد من أحد المجتهدين''. (پھر جب وہ کتاب اللہ میں مسئلہ نہ پاتے تورسول ﷺ کی حدیث کو لیتے،خواہ وہ حدیث مشہور فقہاء میں دائرسائر ہوتی یا کسی شہر یا کسی خاندان یا کسی خاص طریقہ سے مخصوص ہوتی ،اورخواہ اس پرصحابہ وفقہاء کا عمل ہوتا یا نہ ہوتا،اور جب تک مسئلہ میں کوئی حدیث موجود ہوتی اس وقت تک اس مسئلہ کے خلاف نہ آثار میں سے کسی اثر کی پیروی کی جاتی اورنہ ہی مجتہدین میں سے کسی مجتہد کے اجتہاد کی)۔

غرض یہ وہ وجوہ ہیں جن کی بناء پرمتقدمین میں اوراس دور کے بعض ارباب

روایت میں بہت سی احادیث کی تصحیح وتضعیف کے سلسلے میں اختلاف ہوگیا، ارباب ظواہر نے اپنے مذہب کی بناءاسی عہد کی تحقیقات پر رکھی ،لیکن محققین کے نزدیک اس بارے میں صدراول کا فیصلہ معتبر ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ”شرح سفر السعادۃ“ الموسوم به ”المنهج القويم في شرح الصراط المستقيم“ میں فرماتے ہیں:

اورزمان متأخرمیں حدیثوں کی صحت وضعف کاحکم زمان سابق سے جدا ہے، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ حدیث متقدمین کے زمانے میں صحیح ہوبسبب اس کے کہ ان راویوں میں جومتقدمین اورآں حضرتﷺ کے درمیان واسطہ تھے صحت وقبول کے شرائط جمع تھے،اور بعد میں دوسرے راویوں کی وجہ سے- جوان کے بعد آئے-اس میں ضعف پیدا ہوگیا ،پس متأخرین محدثین کے کسی حدیث پرضعف کاحکم لگادینے سے لازم نہیں آتا کہ وہ حدیث مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں بھی ضعیف ہی ہو،اور یہ نکتہ ظاہر ہے، اوربعض محققین کے اس بیان سے بھی (جوانہوں نے ذکرکیا ہے کہ حدیث کے تواتر ،شہرت اور وحدت کے بارے میں صدر اول کا حکم معتبر ہے ،ورنہ بہت سی وہ حدیثیں کہ جواس زمانہ میں آحادتھیں اور بعدکوان کے بہت سے طریقوں کے وجود میں آجانے کے باعث کہ جوزمان مابعد میں اس علم کے رواج پانے اورطالبین ومؤلفین کی کثرت ہوجانے سے پیدا ہوگئے شہرت کے درجہ پر جاپہونچیں گی)اس بات پرروشنی پڑتی ہے۔(دیکھئے:امام ابن ماجہ اورعلم حدیث ازص/۲۰۰تا۲۰۵)

مثال:جهر بسمله وسر بسمله في الصلوٰة.کے بارے میں احادیث مختلف ہے، جہر بسملہ فی الصلوۃ میں سب سے عمدہ حدیث نعیم المجمی کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے ابو ہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھی، انہوں نے "**بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**" پڑھا؛ پھر ام القرآن پڑھا، یہاں تک کہ جب "**غیر المغضوب علیهم ولاالضالین**" تک پہنچے تو آمین کہا جب سلام پھیرا تو فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ میری نماز آقا ﷺ کی نماز کے سب سے زیادہ مشابہ ہے۔ (نسائی ،باب قراءۃ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ،رقم:۹۰۵)

سر بسملہ فی الصلوۃ کے بارے میں سب سے قوی دلیل حضرت انسؓ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے آپ ﷺ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی میں نے ان میں سے کسی سے نہیں سنا کہ انہوں نے جہراً بسم اللہ پڑھی ہو، اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہے: "**فكانوا يستفتحون**" ب (**الحمد لله رب العالمين**) بسملہ کا کوئی ذکر نہیں۔ (مسلم، باب حجۃ من قال لایجہر بالبسملہ ،رقم:۳۹۹) جہر بسملہ وسر بسملہ دونوں حدیث متعارض ہے تو حنفیہ نے ترک جہر کو ترجیح دی چونکہ وہ عمل متوارث کے موافق ہے۔

مختلف فیہ اخبار: مختصر تعارف

مختلف فیہ اخبار: مختصر تعارف

(ا) خبر مرسل: وہ حدیث ہے جس کی سند کا آخری حصہ نہ بیان کیا گیا ہو۔ تابعی قال رسول اللہ ﷺ کہہ کر حدیث بیان کرتا ہو، خواہ تابعی بڑے رتبہ کا ہو یا معمولی درجہ کا۔

ابن الحنبلی ''قفو الأثر'' میں فرماتے ہیں کہ پسندیدہ تفصیل اس سلسلہ میں یہ ہے کہ صحابی کی مرسل روایت نیز اہل قرنِ ثانی کی مرسل روایت بالاجماع قبول کی جائے گی، رہی بات اہل قرنِ ثالث یعنی تبع تابعین کی مرسل روایت کی، تو حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک قبول کی جائے گی لیکن امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت قبول کی جائے گی جب کہ پانچ امور میں سے ایک امر پایا جائے۔

(ا) یا تو کسی دوسرے نے اس کو مسنداً روایت کیا ہو۔ (۲) یا دوسرے نے اس کو مرسلاً روایت کیا ہو اور ان دونوں روایت کے شیوخ مختلف ہوں۔ (۳) یا صحابی کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہو۔ (۴) یا اکثر علماء کے قول سے اس کی تایید ہوتی ہو۔ (۵) یا یہ بات معروف و مشہور ہو کہ وہ ثقہ ہی سے ارسال کرتا ہے، اسی بنا پر امام شافعیؒ نے مراسیل سعید ابن المسیب کو قبول کیا ہے۔

لیکن مختار اور پسندیدہ مذہب یہ ہے کہ عادل ثقہ کی مراسیل مطلقاً قبول کی جائیں گی۔ (دیکھئے اعلاء السنن: ۸۵)

(۲) خبر الواحد اذا خالفہ الراوی:

اگرراوی کا عمل اپنی روایت کے خلاف ہے، تو حنفیہ کے نزدیک صحابی کی رائے اس کی روایت پر مقدم ہوگی اور خبر پر عمل کو ساقط کردے گی، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ولوغ کلب کے بعد برتن کو سات مرتبہ دھویا جائے؛ لیکن دوسری طرف ان کا عمل اس کے خلاف ہے؛ چناں چہ دارقطنی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے تین مرتبہ دھونے پر ہی اکتفاء کیا۔ (دارقطنی، رقم:۱۹۳)

چنانچہ راوی کی مخالفت کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ ممکن ہے وہ اس کو بھول گیا ہو یا فتویٰ دینے کے وقت وہ مستحضر نہ ہو یا اس کی دلالت کو وہ سمجھ نہ سکا ہو وغیرہ لیکن اگر وہ ان احتمالات یا اس کے مانند احتمالات کی نفی کرتا ہے تو وہ غیر معصوم ہے اور اس کا اس خبر واحد کی مخالفت کرنا عدالت کو ساقط نہیں کرے گا، خلاصۂ کلام حدیث مرفوع پر عمل واجب ہے او اس کے علاوہ کو چھوڑ دیا جائے گا۔

(۳) خبرالواحد فی الحدود:

جب یہ بات معلوم ہوچکی کہ خبر واحد موجب عمل ہے احکام میں، اس میں حدود و کفارات وغیرہ میں کوئی فرق نہیں ہے، چنانچہ جس طرح خبر واحد دوسری جگہ میں معتبر ہے، اسی طرح حدود و کفارات میں بھی معتبر ہے، یہی امام ابو یوسفؒ نیز جصاص کا پسندیدہ مذہب ہیں۔

لیکن بعض حنفیہ -جن میں امام کرخیؒ بھی شامل ہیں- فرماتے ہیں کہ خبر واحد حدود میں حجت نہیں ہیں، دلیل آپ ﷺ کا فرمان ہے ''ادرؤوا الحدود

بــالشبهـات ’’(ابن ماجہ، رقم:۲۵۴۵) لہذ ااس کااثبات ایسی چیز سے جائزنہیں،جس میں شبہ ہوجیسے اس کااثبات قیاس سے جائزنہیں ہے۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ خبر واحداس میں معتبر ہے،خبر واحد اگر چہ ظنی ہے؛لیکن اس سے بہت سے احکام کا ثبوت ہوتا ہے۔(دیکھئے اصول سرخی:۱/۲۵۰)

(۴)زیادۃالثقہ :

اس سے مراد یہ ہے کہ ایک جماعت اپنے کسی شیخ سے کوئی حدیث روایت کرے؛لیکن ان میں سے کوئی ایک زیادتی بیان کرنے میں منفرد ہو، جب کہ باقی دوسروں نے اپنے شیخ سے اس زیادتی کو بیان نہ کیا ہو،تواس سلسلہ میں حافظ ابن حجرؒ ’’شرح نخبہ‘‘ میں فرماتے ہیں: کہ صحیح وحسن کے راوی کی زیادتی اس صورت میں مقبول ہوگی جب کہ وہ اوثق (جنہوں نے اس زیادتی کوروایت نہیں کیا ہے) کی روایت کے منافی نہ ہو۔اس لئے کہ زیادتی اوراوثق کی روایت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، چنانچہ اس کومطلقاً قبول کیا جائے گا، وجہ یہ ہے کہ وہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے۔

لیکن اگر ثقہ کی زیادتی اوثق کی روایت کے خلاف ہو،تواس وقت ترجیح سے کام لیا جائے گا،راجح کوقبول کیا جائے گا،اورمرجوح کورد کردیا جائے گا۔

مثال: **مالک عن نافع عن ابن عمرؓ عن النبیﷺ فرض زکوٰۃ الفطرہ علی کل حر أو عبد ذکر أو أنثیٰ من المسلمین.**(موطامالک،رقم:۶۳۹)

امام نافع کے دوسرے شاگردوں کے مقابلہ میں امام مالکؒ ''من المسلمین'' کی زیادتی میں منفرد ہیں۔

اسی طرح ثقہ راوی اسناد کو متصلاً اور موقوف کو مرفوعاً روایت کرنے میں منفرد ہو تو اس کی یہ زیادتی قبول کی جائے گی، جیسے موطأ مالکؒ میں ہے:''رواه مالك قال: بلغنا أن أبا هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: للمملوك طعامه و كسوته. رواه معضلاً هٰكذا. (موطأ مالک، رقم:۱۸۸۷) اور ابراہم بن طہمان اور نعمان بن عبدالسلام نے اس روایت کو عن مالك عن محمد بن عجلان عن أبيه عن أبي هريرة روایت کیا ہے، نیز امام مسلم نے اس روایت کو عن بكير بن الأشج عن محمد بن عجلان مولىٰ فاطمة عن أبي هريرة روایت کیا ہے۔ (مسلم شریف، رقم:۱۶۶۲)

راجح یہ ہے کہ ثقہ کی زیادتی قبول کی جائے گی، جس نے بھی زیادتی کو بیان کیا وہ مثبت ہے، اور جس نے اس کو بیان نہیں کیا، ان سے نہی و نفی منقول نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس زیادتی کو بیان کرنا ضروری نہ سمجھتے ہوں، یا وہ اس کو بھول گئے ہوں یا تحدیث سے پہلے ہی اٹھ کر چلے گئے ہوں وغیرہ۔

(۵) خبر الواحد علی ما تعم بہ البلویٰ

(۶) خبر الواحد اذا خالف القیاس

دونوں کے بارے میں تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

خاتمہ

میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس بحث کے اتمام کی توفیق عطا فرمائی نیز اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعاء ہے کہ وہ اس کو دنیا و آخرت میں نافع بنائے۔

نتائج، جنہیں میں نے مذکورہ بحث سے اخذ کیا ہے، ذیل میں نقل کرتا ہوں:

(۱) احادیث کی تقسیم متواتر و آحاد، یہ قرنِ اول یعنی صحابہ و تابعین کے بعد کی ہے، صحابہ و کبارِ تابعین کے درمیان یہ تفریق نہیں تھی، حدیث رسول ان کے نزدیک ایک ہی درجہ کی تھی۔

(۲) یہ تفریق اس وقت وجود میں آئی، جب مختلف فرقوں کا ظہور ہوا اور فتنے نمودار ہونے لگے، خصوصاً معتزلہ جنہوں نے عقل کو قرآن وسنت پر مقدم رکھا اور اس کو معیار قرار دیا، یہاں تک کہ شیاطین ان پر ایسے حاوی ہوائے کہ وہ کہنے لگے کہ یہ اخبار ظنی ہے، یہ قطعی ہے، اس کے لئے دلیل ظنی ہے اور اس کے لئے دلیل قطعی ہے اور بے جا تاویلات کرنے لگے اور سنت کا درجہ ان کے نزدیک اس سے بھی کم تھا، وہ کہتے کہ اخبارِ آحاد ظنی الثبوت ہیں؛ کیونکہ یہ انسان کی خبر ہے، جو خطا و نسیان کا شکار ہے: لہٰذا اس کو امورِ اعتقادیہ میں قبول نہیں کیا جائے گا، اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے عقیدہ کی بنیاد امرِ ظنی پر رکھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بہت سی احادیث کو رد کر دیا اور اپنے مذہب کی تائید کے لئے قرآن وسنت کو پیش کیا، لیکن علماء اہل سنت والجماعۃ دفاعِ دین کی خاطر کھڑے ہوئے اور ان کے سامنے پوری حقیقت کو واضح کیا۔

وہ حضرات، جو اخبار آحاد کی حجیت کا انکار کرتے ہیں، انہوں نے اعداء اسلام یعنی مستشرقین اور بعضے مستغربین کے لئے دروازہ کھول دیا ہے انہوں نے اسی انکار کو بنیاد بنایا اور اس پر طرح طرح کے شبہات گھڑنے لگے؛ لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اس میں باطل کا بول بالا ہو، کیوں کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری کا وعدہ کیا ہے، اسی طرح اس نے سنتِ رسول کی حفاظت کا بھی وعدہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "**انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون**". (سورۂ حجر: ۹)

الغرض مستشرقین کے شبہات کے ازالہ کے لئے علماء نے انتہائی مدلل تحریریں لکھی، اور اس مسئلہ کو مکمل آشکارا کیا، اللہ تعالیٰ ان کی جد وجہد کو قبول فرمائے۔ آمین

﴿اہم مراجع وماخذ﴾

نمبر	اسمائے کتب	مصنف ومؤلف
۱	الابتہاج فی أحادیث المنہاج	ناصرالدین الالبانی
۲	الاحکام فی أصول الأحکام	علامہ آمدی
۳	اختلاف الأئمۃ	شیخ زکریا صاحب
۴	أصول البزدوی	فخرالاسلام البزدوی
۵	أصول السرخسی	علامہ سرخسی
۶	أصول الشاشی	احمد بن محمد بن اسحاق شاشی
۷	اغاثۃ اللہفان	ابن قیم الجوزیۃ
۸	ابن ماجہ اور علم حدیث	مولانا عبدالرشید نعمانی
۹	البدایۃ والنہایۃ	ابن کثیر
۱۰	تأویل مختلف الحدیث	ابن قتیبۃ
۱۱	تأنیب الخطیب	علامہ زاہد الکوثری
۱۲	تاریخ حدیث ومحدثین	محمد ابوزہرہ مصری
۱۳	تبییض الصحیفۃ	علامہ سیوطی
۱۴	تخریج الحدیث نشأتہ ومنہجیتہ	ابواللیث خیرآبادی
۱۵	تدریب الراوی	علامہ سیوطی

نمبر	کتاب	مصنف
۱۶	تذکرۃ الحفاظ	علامہ ذہبیؒ
۱۷	التقریب والتیسیر	علامہ نوویؒ
۱۸	تقیید العلم	خطیب بغدادیؒ
۱۹	التمہید	ابن عبدالبر مالکیؒ
۲۰	تیسیر مصطلح الحدیث	الدکتور محمود الطحان
۲۱	جامع بیان العلم وفضلہ	ابن عبدالبر مالکیؒ
۲۲	حجیت حدیث	مولانا تقی عثمانی
۲۳	حدیث اور فہم حدیث	مولانا عبداللہ معروفی
۲۴	درسِ ترمذی	مولانا تقی عثمانی
۲۵	الرسالہ	امام شافعیؒ
۲۶	الرسالہ المستطرفۃ	علامہ کتانیؒ
۲۷	رفع الملام عن الأئمۃ الأعلام	ابن تیمیہؒ
۲۸	سنن ابن ماجہ	امام ابن ماجہؒ
۲۹	سنن أبي داود	امام داود سجستانیؒ
۳۰	سنن ترمذی	امام ترمذیؒ
۳۱	سنن کبریٰ	امام بیہقیؒ
۳۲	سنن نسائی	امام ابوعبدالرحمٰن نسائیؒ
۳۳	السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی	الدکتور مصطفیٰ السباعیؒ
۳۴	شرح نخبۃ الفکر	حافظ ابن حجرؒ

۳۵	شرح عقائد نسفی	مولانا وارث علی صاحب
۳۶	الشفاء بتعریف حقوق المصطفی	قاضی عیاضؒ
۳۷	الصحاح	علامہ جوہریؒ
۳۸	صحیح ابن حبان	علی بن بلبانؒ
۳۹	صحیح البخاری	امام بخاریؒ
۴۰	صحیح مسلم	امام مسلم بن حجاج قشیریؒ
۴۱	ظفر الأمانی	مولانا عبد الحیٔ لکھنویؒ
۴۲	العالم والمتعلم	علامہ سیوطیؒ
۴۳	عقد الدرر	یوسف معروف بن مصطفیٰ
۴۴	عمدۃ الحواشی علی أصول الشاشی	ملا فیض الحسن گنگوہی
۴۵	فتح المغیث	علامہ سخاویؒ
۴۶	فتح الملہم	علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
۴۷	القاموس المحیط	مجد الدین فیروز آبادی
۴۸	کشف الاسرار	عبد العزیز بن احمد بخاری
۴۹	اللباب فی اصول الفقہ	الدکتور صفوان عدنان داودی
۵۰	لسان العرب	ابن منظور الافریقی
۵۱	الفیۃ الحدیث	علامہ سیوطیؒ
۵۲	مجموع الفتاویٰ	علامہ ابن تیمیہؒ
۵۳	مختصر الصواعق المرسلۃ	ابن قیمؒ

۵۴	المستصفٰی	امام غزالیؒ
۵۵	المستدرک علی الصحیحین	امام حاکم نیشا پوریؒ
۵۶	مسلم الثبوت	مولانا محب اللہ بہاریؒ
۵۷	مسند امام احمد بن حنبل	امام احمد بن حنبلؒ
۵۸	مصطلح الحدیث	ناصر الدین الألبانی
۵۹	معاییر الحنفیۃ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۶۰	المعجم الأوسط	امام طبرانیؒ
۶۱	معجم مقاییس اللغہ	ابن فارسؒ
۶۲	المغنی	ابن قدامہؒ
۶۳	مقدمہ ابن الصلاح	ابن الصلاحؒ
۶۴	منہج النقد عند المحدثین	محمد مصطفیٰ الأعظمی
۶۵	نزہۃ النظر	حافظ ابن حجر عسقلانیؒ
۶۶	نصب الرایۃ	علامہ زیلعیؒ
۶۷	نور الأنوار	ملا جیونؒ

تقسیم حدیث چھارگانه
بلحاظ تعداداسانید
بلحاظ غایت سند
قلت وسائط کے اعتبار سے
باعتبار روایت
متواتر
مشہور (مستفیض)
عزیز
غریب
آحاد
مرفوع
موقوف
مقطوع
فرد مطلق
فرد نسبی
صریح
حکمی
قولی
فعلی
حکمی
روایت الاقرآن
مدبج
روایت الاکابرعن الاصاغر
روایت الاصاغرعن الاکابر
علو (عالی)
نزول (نازل)
مطلق
نسبی
موافقت
بدل
مساوات
مصافحہ
مقبول
مردود
صحیح لذاتہ
صحیح لغیرہ
حسن لذاتہ
حسن لغیرہ
اسباب ردّ
طعن
سقط
واضح
خفی (تدلیس)
معلق
مرسل
معضل
منقطع
ظاہر
خفی
تدلیس الاسناد
تدلیس الشیوخ
تدلیس
التسویہ
متعلق بہ عدالت
متعلق بہ ضبط
کذب
حدیث موضوع
تہمت کذب
حدیث متروک
فسق
منکر
جہالت کے اسباب
بدعت
مستلزم کفر
مستلزم فسق
عدم تسمیہ
غیر معروف تسمیہ
قلیل الروایہ ہونا
مجہول العین
مجہول الحال (مستور)
فحش غلط
حدیث منکر
کثرت غفلت
حدیث منکر
وہم
حدیث معلل
مخالفت ثقات
سوء حفظ
لازم (حدیث شاذ)
طاری (حدیث مختلط)
مدرج الاسناد
مدرج المتن
مقلوب
مزید فی متصل الاسانید
مضطرب
مصحف ومحرف